انتہاؤں میں رابطہ..... پرنٹ اور ڈجیٹل ایک ساتھ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

فروری 2025

چیف ایڈیٹر:
محمود شام

127

شہر شہر

استقبالِ رمضان

خصوصی تحریریں

پاکستانی سوشل میڈیا پر کتنا وقت گزارتے ہیں؟

قیمت: پاکستان میں 500 روپے...... بیرون ملک: 5 ڈالر۔ (ای میگزین سالانہ 20 ڈالر)

BUSINESS VALUE ACCOUNT
PLUS

UP TO
RS.

CRORE*
Free
Inventory
Insurance

New Benefits

- Free Funds Transfer & Interbank Funds Transfer
- Free ATM Transactions from Other Banks' ATMs

Plus Benefits

- ATM Snatching Insurance
- Business Inventory Insurance
- Free Cheque Books
- Free PayPak Debit Card
- Free Pay Orders
- Free Intercity Transactions

* Terms and Conditions apply.

ZABARDAST BANK - BEMISAAL SERVICE

021-111-100-333 0301-1177777
www.silkbank.com.pk /silkbankpk SMS 9873

SILKBANK
Yes we can

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد 12: شمارہ: 02

فروری 2025

قیمت فی پرچہ: 500 روپے۔ سالانہ: 5000 روپے۔ بیرون ملک – 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر : محمود شام

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

پروجیکٹ ہیڈ 'اطراف' ڈجیٹل: رخشندہ محمود

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا) عاصم متین خان (نیویارک)

نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ) ، پروفیسر شاداب احمد صدیقی (حیدرآباد)

ڈیزائن : محمد شاہد رفیق : عکاسی : شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

فروری خاص

ہفتہ وار سوال....؟

'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

75-82

'اطراف' پاکستانی زبانوں کو معدوم نہیں ہونے دے گا — اطرافیہ — 05

ٹی وی ڈراما مافیا — ☆ سلیم عمران — 06-08

ٹی وی ڈراموں کے موضوعات — ☆ جماعت اسلامی کے مرکزی میٹرنگ سیل کی رپورٹ — 09-10

سوشل میڈیا پر آپ کتنا وقت گزارتے ہیں؟ — ☆ اطراف کا عالمگیر سروے — 11-20

ملائشیا میں رمضان — ☆ حافظ نعمان ساجد — 21-22

رمضان المبارک اور امریکی مسلمان — ☆ عاصم متین خان (نمائندہ خصوصی) — 23-24

آسٹریلیا میں رمضان — ☆ اختر علی مغل — 25-26

باجوڑ، بورے والا، گوجرانوالہ میلسی میں استقبال رمضان — ☆ ضیاالدین، رانا شاہد، صدام ساگر، طارق جمیل — 30-36

شب برأت کیسے منائی جائے؟ — ☆ نازیہ آصف، گجرات — 39-40

عمر کا سورج — ☆ سعیدہ افضل کی آپ بیتی — 43-46

مجھے یاد ہے ذرا ذرا..... — ☆ مہناز حسن، سابق ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات سندھ — 49-50

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا — ☆ فرید ذکریا — 51-54

ہمارے غیر ملکی مہمان — ☆ جہاں آرا — 59-62

تذکرہ کتابوں کا — ☆ خان ظفر افغانی — 67-69

الجزمت "بنوقابل" — ☆ شعیب ہاشمی — 73-74

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت : اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

کفالتِ یتیم سے --- جنّت کا حصول بھی --- رفاقتِ رسولؐ بھی

الخدمت
ALKHIDMAT

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN

دُعاء

تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے

تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے

آپ بھی زکوٰۃ وعطیات دے کر شامل ہو جائیں۔۔۔لاکھوں دُعاؤں میں

زکوٰۃ اور عطیات کے لیے

زکوٰۃ میزان بینک 0 2 1 4 0 1 0 1 0 9 5 1 2 0

عطیات میزان بینک 0 2 1 4 0 1 0 0 8 6 1 1 5 1

0800 44448

www.alkhidmat.org/give

اطرافیہ

'اطراف' پاکستانی زبانوں کو معدوم نہیں ہونے دے گا

زبانیں معدوم کیوں ہوتی ہیں۔
کیوں ہوتی رہی ہیں۔
ان میں جب انسان اظہار نہیں کر پاتے۔ خائف حکمران مختلف قسم کی پابندیاں عاید کرتے رہتے ہیں۔ زبان کو استعمال نہیں ہونے دیتے۔ جب آئین نو سے ڈرایا جاتا ہے۔ طرز کہن پر اڑا جاتا ہے۔ زبان کو اظہار کے نئے آلات۔ نئی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیا جاتا۔ آس پاس کے حالات گرد و پیش کی رونمائیوں اظہار کا پیراہن نہیں پہنایا جاتا۔ سارا غبار سینے میں دبایا جاتا ہے۔ اسے اظہار کا راستہ نہیں دیا جاسکتا۔
زبانوں کے فروغ اور ارتقا کے ادارے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے سربراہ ان کی ترقی کی اہلیت نہیں رکھتے۔ انہیں سفارش پر مسلط کیا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں سزا دینے کے لیے متعین کیا جاتا ہے۔ وہ پھر کہیں منفعت بخش ادارے میں تقرری کے لیے دن رات کوششیں کرتے رہتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ زبان مافی الضمیر کے اظہار سے ہی آگے بڑھتی ہے۔ اس کی طاقت اس کی عبارت Content ہوتی ہے۔ ہم ماہنامہ 'اطراف' کے ذریعے دس سال سے ہی جدوجہد کر رہے ہیں کہ عبارت کو طاقت بنایا جائے۔ ہم اُردو کو وفاقی اور کروڑوں پاکستانیوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ زبان ہمارے نزدیک صرف شاعری۔ افسانے۔ ناول اور تنقید کا نام نہیں ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے صحت۔ تجارت۔ اقتصادیات۔ ارضیات۔ نباتات۔ جمادات۔ سیاسیات۔ کیمیا۔ طبعیات۔ اور بے شمار علوم کے ایک وسیلہ اظہار۔ آلہ اعتبار کا نام ہے ہمارے ہاں یہ تصور اور تاثر ذہن نشین کر دیا گیا ہے کہ اُردو صرف شعر و افسانہ تک محدود ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبے جو زیادہ ضروری اور ناگزیر ہیں۔ ان کا بیان صرف انگریزی میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے نئی نسلوں کو اُردو سے گریزاں کیا جاتا ہے حالانکہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کئی دہائیاں پہلے اُردو میں سارے علوم کی اصطلاحات منتقل کر چکی تھی۔ اُردو میں میڈیکل۔ ریاضی اور سائنسی علوم میں تعلیم یافتہ ہمارے ہاں بہت کامیاب مثالیں پیش کر چکے ہیں۔
اسی طرح کا سلوک پنجابی۔ سندھی۔ سرائیکی۔ بلوچی۔ براہوئی۔ پشتو۔ ہندکو۔ بلتی۔ شینا۔ کشمیری سے بھی کیا گیا۔ ان کے فروغ کے لیے قائم شدہ ادارے۔ ان کی جڑیں کاٹنے میں استعمال کیے گئے زبانیں انسانوں کے درمیان رابطے اور محبت کے بڑھاوے کے لیے ہوتی ہے۔ مگر ان کو حکمرانوں نے آگ لگانے کے لیے۔ آپس میں لڑوانے کے لیے استعمال کیا۔ کیونکہ سردار۔ جاگیردار سیٹھ اپنی بداعمالیوں کو چھپانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے جبر۔ تعصّبات۔ ناانصافیوں کو روکنے کی بجائے۔ ان پر عوامی اظہار پر نا کے لگائے۔ بے باک لوگوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ پھانسیاں دی گئیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق شہادت دے رہے ہیں کہ آج شاہ لطیف۔ بلھے شاہ۔ سلطان باہو۔ وارث شاہ۔ رحمٰن بابا۔ غالب۔ اقبال۔ مست توکلی کے اشعار۔ اقوال تو لوگوں کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ لیکن ان پر جبر کرنے والے پابندیاں عاید کرنے والے سرداروں۔ بادشاہوں کے نام ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔
تحقیقی ادارے۔ محققین۔ عبارت کی تلاش میں پتھروں پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ درختوں کی چھالیں پڑھتے ہیں۔ اس زمانے کے برتنوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یعنی عبارت ہی انسان کے ارتقا کی محافظ ہے۔ حرف ہی انسان کا حقیقی ہمدم ہے۔ انسانی فکر کی تاریخ الفاظ میں ہی محفوظ ہے۔
ضرورت یہ ہے کہ جہاں جہاں کوئی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ چاہے قومی زبان ہو۔ علاقائی زبانیں۔ وہاں اظہار کی جدید ترین ٹیکنالوجی بھی پڑھائی جائے۔ تازہ ترین ایجادات کا استعمال سکھایا جائے۔ طالب علموں کو صرف شعرا۔ ناول نویسوں افسانہ نگاروں۔ اور نقادوں کے تذکروں تک نہیں۔ بلکہ اپنے اپنے علاقے۔ اور سماج میں اوزاروں کے استعمال کے عرصے بھی بتائے جائیں۔ کہ پہیہ اس علاقے میں کب پہنچا۔ پتھر سے لکڑی۔ لکڑی سے لوہے۔ لوہے سے پلاسٹک کے زمانے کونسے ہیں۔ اب جب برقی آلات نے اظہار کو تیز تر کر دیا ہے۔ اس میں ہماری زبانیں کہاں تک ساتھ دے رہی ہیں۔
ہمیں فخر ہے کہ 'اطراف' نے برقی آلات۔ ڈجیٹلائزیشن۔ سوشل میڈیا کو پرنٹ کا رقیب نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ اسے زبانوں کے بڑھاوے کا وسیلہ ہی خیال کیا ہے اس لیے جنوری 2025 سے 'اطراف' کا مقصود پرنٹ اور ڈجیٹل ایک ساتھ ہے آج کی پاکستانی زبان۔ اپنے محاسن اور عیوب۔ اپنی مصیبتوں اور راحتوں کے اظہار فارسی عربی ملی اُردو کے ساتھ ساتھ وہ اُردو بھی ہے جس میں مسلسل پنجابی الفاظ شامل ہو رہے ہیں۔ سرائیکی۔ سندھی۔ بلوچی۔ براہوی۔ پشتو۔ بلتی کے خوبصورت پیوند لگ رہے ہیں۔ انگریزی کے الفاظ بھی اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ زبانیں اسی طرح زندہ رہتی ہیں۔ وہ نئے الفاظ۔ نئے محسوسات نئے اظہار۔ کا راستہ نہیں روکتی ہیں۔
پاکستانی زبانیں احمد مرزا جمیل۔ مطلوب الحسن سید اور میر خلیل الرحمن کی ممنون ہیں کہ انہوں نے برقی خوش نویسی کے لیے سرمایہ اور سوچ وقف کی اور اب اُردو کو تیز رفتاری عطا ہوئی۔ اس کے بعد ہی صفحہ بندی۔ اور کاغذ کے بغیر نیوز روم کا قیام ممکن ہوا۔ اب انجمن ترقی اُردو اور این ای ڈی یونیورسٹی اُردو کے لیے ایک اور سنگ میل عبور کرنے والے ہیں۔ Optical Charactor Recognization کی تکنیک سے بھی اُردو فیضیاب ہونے والی ہے۔
ماہنامہ 'اطراف' اپنی پرنٹ اور ڈجیٹل ایک ساتھ کی کوشش میں متعلقہ اداروں کے تعاون سے ہی اپنے اہداف حاصل کرسکتا ہے۔ پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اُردو۔ فارسی۔ پنجابی۔ بلوچی۔ سرائیکی۔ سندھی۔ پشتو شعبوں سے سیاسیات۔ فلسفے۔ نفسیات۔ سوشیالوجی کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے اشتراک کی درخواست ہے۔
آیئے پاکستان کے لوگوں کو آگے لے کر چلیں۔
پاکستان کی زبانوں کو جدید تر علوم کی پہنائیوں سے ہم آہنگ کریں۔

محمود شام

"'اطراف' کو فخر ہے کہ وہ ایک بہت ہی طاقت ور مافیا۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز سے ٹکرا رہا ہے۔ تیس سے زیادہ تفریحی چینل صرف پیسہ کمانے کے لیے سماج کو بگاڑ رہے ہیں۔ زبان کو خراب کرنے پر تلے ہیں۔ ہمارے مذہبی شعائر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ہمارے سماجی اقدار، ثقافتی ورثے کو تباہ کر رہے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے افسانہ نویس۔ ناول نگار۔ تو ٹی وی چینلوں کے قریب سے گزر بھی نہیں سکتے۔ مگر سر قد کرنے والے فارمولے ڈرامہ لکھنے والے پیش پیش ہیں۔ یہ ایک قومی فریضہ ہے۔ جو 'اطراف' اس مافیا کے خلاف جدو جہد کر کے انجام دے رہا ہے۔"

گرین چینل۔ پہلے سے ڈرامے کا بیڑہ غرق کرنے والے چینلوں کے نقش قدم پر

سلیم عمران کی بے باک تحریر

زبان و بیان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے نئے انتظامات کئے گئے ہیں

فرحت اشتیاق۔ حسینہ معین کے نقش قدم پر چلنے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں

گرین چینل نے اپنی منفرد شناخت پوری طرح کھو دی ہے۔ اے عشق جنوں مختلف ڈراموں کو جوڑ کر لکھا گیا ہے۔

گرین چینل نے پہلے سے ڈرامے کا بیڑہ غرق کرنے والے چینلوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اب اپنے آپ کو پوری طرح ایسی پہچان اور شناخت کا چولا پہنا دیا ہے جس کو چیلنج کرتے ہوئے۔ ابتدا میں گرین کے ڈرامے مختلف کہلائے جانے لگے تھے۔ اس چینل کے کرتا دھرتا کہا کرتے تھے کہ وہ پی ٹی وی کے عہد کو پھر سے زندہ کریں گے اور ان کے چینل کا ڈراما ان لگے بندھے فارمولوں سے بالکل ہٹ کر الگ اور مختلف ہوگا۔ آغاز میں لوگ کہتے ہیں کہ گرین کے کچھ ڈرامے حقیقتاً ان کے دعوے کے عین مطابق کافی حد تک ان روایتی اور ڈرامے کی بربادی کی تہمت سے سرشار ہونے والے چینلوں سے الگ قسم کے ہوا کرتے تھے۔ جانکار اور ان راستوں کا درست ادراک رکھنے والے قیافہ شناسوں نے پہلے ہی پیش گوئی

فہیم برنی نے ڈرامے کو
بربادی کے راستے پر ڈالا

کر دی تھی کہ گرین نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے وہ ایک کٹھن اور طویل نہ تھکنے والی لڑائی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ ناظرین کے ذوق اور ڈرامے کی پرکھ کے معیارات تباہ ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مدت سے زہر پینے والے کسی انسان کو آپ امرت پلا دیں تو اسے امرت کا ذائقہ فوری طور پر متاثر نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اثر ہو سکے گا۔ (انسان تو وہ مخلوق ہے جسے آسمانوں سے اتارے گئے من سلویٰ کے ذائقے بھی متاثر نہیں کر سکے تھے) ایسے حالات میں گرین ہو یا کوئی بھی چینل اسے ناظرین کو اندھے کنوئیں سے نکالنے کے لئے جوکھم اٹھانے اور مسلسل ضربوں سے اس پتھر کا سینہ شق کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کے سینے میں کبھی دل دھڑکا کرتا تھا۔ گرین نے چند ہی مہینوں میں اپنی ناکامی تسلیم کرتے ہوئے ہار مان لی اور خود کو اسی کنوئیں میں جا گرایا جہاں سے آسمان بھی اتنا ہی دکھائی دیتا ہے جتنا ایک چھوٹے سے سوراخ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ (ایسے ہی دعوے ماضی میں بول نام کے چینل نے بھی کئے تھے اس کا انجام تو گرین سے بھی زیادہ عبرت ناک ہوا کہ اس کے شروع ہوتے ہی اختتام ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہیں گرین کا انجام بھی ایسا ہی تو نہیں ہونے والا۔)

''اقتدار'' یہ گرین چینل کے اس ڈرامے کا عنوان ہے جسے لکھا ہے۔ ہما حنا نفیس نے۔ (یہ دو بہنیں ہیں جو مل کر ڈرامے لکھا کرتی ہیں) اس ڈرامے کے ڈائریکٹر فہیم برنی ہیں۔ ماضی میں کبھی فہیم برنی ڈرامے کی دنیا کے مصروف ہدایت کار ہوا کرتے تھے یہ وہ دور تھا جب ڈرامے کا منظر تبدیلی کا متقاضی تھا۔ چنانچہ ان موصوف نے ڈرامے کو بربادی کی راستے پر ڈالنے کی ابتدا کی۔ سیما غزل پہلی ایسی ڈراما نویس تھیں جن کے ڈراموں نے ناظرین سے معیاری ڈرامے دیکھنے کا ذوق چھین لینے میں کردار ادا کیا۔ کاشف نثار کہا کرتے ہیں کہ اگر پی ٹی وی کے ڈراموں کی جگہ ان ڈراموں نے لے لی جنھیں ایک طبقہ غیر معیاری کہتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ تبدیلی کے خواہاں تھے اور وہ پی ٹی وی کے ڈراموں سے اکتا چکے تھے۔ ایسے میں جس قسم کی مصنوعات انھیں میسر آئیں وہ ان کے ساتھ ہو لئے۔

اصل میں ناظرین تنوع چاہتے تھے اور پی ٹی وی کے ارباب بست وکشاد ان تقاضوں کو سمجھنے سے عاری رہے۔ جس طرح ہمارے ملک میں اور کئی شعبوں میں تبدیلی کے حوالے سے ایسی سوچوں اور

مقامی چینلز پرانے راستے پر چل کر پاکستانی ذہنوں کو بنجر بنا رہے ہیں

مصنوعات کو فروغ حاصل ہوا جن کی وجہ سے متذکرہ شعبے پستیوں میں گرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ زندگی اور سماجوں کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر کچھ سالوں کے بعد انسانی فطرت کو تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے میں جن معاشروں میں کم صلاحیت کے حامل افراد موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایسے معاشرے بدنصیبی سے اپنی ہی تباہی اور بربادی کے راستے کو ہنستے ہوئے اور پرجوش انداز میں قبول کر لیتے ہیں۔ یہ پستیوں کا سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی اور تبدیلی اس کی جگہ نہیں لے لیتی۔ تخلیق کے کسی نئے رجحان کو اس وقت تک کامیابی نہیں ملتی جب تک لوگ اس کے لئے خود تیار نہیں ہوتے۔ ساری دنیا میں تفریحی میڈیا کے حوالے سے نئے رجحانات اور تبدیلی کا یہ منظر دیکھنے میں آرہا ہے کہ ناظرین نے یکسانیت سے بھرپور اور دماغ سے خالی بار بار کے دوہرائے ہوئے اپنے مقامی چینلوں کے پروگراموں کو مسترد کر دیا ہے اور ان کی جگہ لے لی ہے ان عالمگیر اداروں نے جنھیں او ٹی ٹی کہا جاتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں تو یہ عالم ہے کہ اوٹی ٹی پلیٹ فارم ہی اب نئی سرمایہ کاری کا سب سے متحرک اور زرخیز شعبے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے انڈیا میں جہاں دنیا کے بڑے بڑے ادارے تفریحات کے شعبے میں مسلسل سرمایہ کاری کر رہے ہیں وہیں ان کے مقامی سرمایہ دار اڈانی وغیرہ بھی اوٹی ٹی میڈیاز میں سرمایہ کاری کرتے دکھائی دیتے ہیں جیسے جیو فلمز اڈانی کا ایسا ہی اوٹی ٹی چینل بتایا جاتا ہے جس نے غیر ملکی وسیع نیٹ ورک کے حامل اداروں کو چیلنج کرتے ہوئے انڈیا میں تفریحات کے وسیع آسمان پر قابض ہونے کے لئے پیش قدمی جاری رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بالکل برعکس پاکستان میں ہمارے روایتی اور پسماندگی کی

حد تک پستیوں میں گرے ہوئے مقامی چینلز مسلسل قدیمی روایتی روشوں پر چلتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے ہیں اور قوم کے اذہان کو مزید بنجر بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان اداروں نے ناظرین کی سوچوں اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو اس طرح مسدود اور زنگ آلود کر دیا ہے کہ وہ ایک جیسے ڈراموں کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جیسے کوئی منشیات کا عادی ہوتا ہے جسے منشیات سے نجات دلانے کے لئے بعض اوقات بڑے سخت اور غیر انسانی اقدامات بروئے کار لانے پڑتے ہیں۔ چنانچہ گرین چینل نے جو بہت معمولی سی انفرادیت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ اس میں بھی پوری طرح ناکام ہو چکا ہے اور اب گرین سے دکھائے جا رہے ہیں ایسے ڈرامے جن کے مناظر، تخیل اور کہانیاں قریب بیس برس پرانی کہانیوں جیسی روایتی اور پسماندہ ذہنیت اور رویوں کی عکاس ہیں۔ اقتدار کی کہانی ایک پھپھسی گھریلو کہانی ہے۔ جس میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی بھی دوسرے ڈرامے سے مختلف ہو۔ اس ڈرامے میں کام کرنے والے فنکاروں میں شامل ہیں۔ انمول بلوچ، علی رضا، جاوید شیخ، روبینہ اشرف، سمیع خان، سیمی پاشا، مزنا وقاص، عاطف راٹھور اور صباحت بخاری کے علاوہ کئی دوسرے فنکار۔

''بجو'' جیو کے اس ڈرامے کو لکھا ہے جویریہ جلیل نے اور اس کے ڈائریکٹر ہیں مظہر معین۔ جویریہ نے قریب 2008 میں ایک ڈراما لکھا تھا اور پیشکش بھی غالباً انھی کی تھی یعنی اس کی پروڈیوسر بھی وہ خود اور ان کے پاکستانی فلموں سے شہرت حاصل کرنے والے شوہر سعود تھے۔ اس ڈرامے کا عنوان تھا ''یہ زندگی ہے'' کہتے

ہیں پاکستان کے ڈرامے کا یہی وہ موڑ ہے جب اسے جہالت کے دلدل میں دھکیلنے کی باقاعدہ شعوری کوشش کی گئی ، ڈرامائی سلسلے میں پہلی بار عورتوں کے کرداروں میں پسماندہ اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے علاقوں میں رہنے بسنے والی عورتوں کی طرز پر ہاتھ نچا نچا کر تمام ہی عورتوں اور مردوں کو لڑتے اور مغلظات بکتے ہوئے دکھایا گیا۔ یہی وہ ڈراما بتایا جاتا ہے جس میں اردو زبان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی۔ ہر چند کہ نجی چینلز کے ڈراما چینلوں نے اردو زبان کی شستہ اور شائستہ پہچان کو قبل ازیں چھین کر اس میں ایسے بدنما اور ناقابل سماعت مکالمے اور الفاظ اور طرز گفتگو کو داخل کر دیا تھا جس کا انجام یہی ہونے والا تھا جو جویریہ جلیل کے ڈرامے ''یہ زندگی ہے'' کو دیکھنے کے بعد سامنے آیا۔ ان زمانوں میں تمام پڑھے لکھے طبقوں میں اس حوالے سے گہری تشویش پائی جاتی تھی اور اکثر گفتگوؤں میں مذکورہ ڈرامے کو ہدف تنقید بنایا جارہا تھا۔ مرحوم عمران اسلم کہا کرتے تھے کہ یہ وقت بہت برا ہے اور نہیں معلوم کہ کہ اس کا انت کہاں اور کیسا ہوگا۔ کیونکہ اس بے ہودہ واہیات ڈرامے کی ریٹنگ بہت آرہی ہے۔ یعنی یہ وہ وقت بھی تھا جب پاکستانی معاشرہ ایک ایسی تبدیلی کو بھی فراخ ذہنی سے قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ جس نے آگے چل کر اسے اچھے اور معیاری معاشروں کی صف سے نکال کر الگ کر دیا۔ ڈراما اور اردو زبان مسلسل سوقیانہ اور پست ترین راستوں پر چلتے ہوئے ایسے مقام کو پہنچ چکی ہے۔ جب کوئی ایسا چینل موجود نہیں ہے جہاں زبان و بیان پر کسی قسم کی جانچ پڑتال کا کوئی نظام موجود ہو، آج وہ عالم ہے کہ دھڑلے سے جس کا جو جی چاہتا ہے وہ بول رہا ہے اور قوم کی اخلاقیات ہی نہیں ان سے غلط اور صحیح کی پہچان کرنے کی صلاحیت بھی چھین لی گئی ہے۔ ادب اور جمالیات کو جتنا نقصان پہنچایا جاسکتا ہے ۔ بے مہار طریق پر پہنچایا جارہا ہے۔ انھی بی بی جویریہ کے حالیہ لکھے ہوئے ڈرامے کا عنوان ہے'' بجو'' جسے ماضی میں مختلف اور معیاری ڈراموں کے ڈائریکٹر۔ مظہر معین نے تیار کیا ہے۔ یہ ایسا وقت ہے جب کوئی بھی اپنے چہرے کی شناخت کے کھو جانے کے احساس تک سے عاری ہو چکا ہے۔ اس ڈرامے میں کام کرنے والے فنکاروں کے نام ہیں۔

جویریہ جلیل (ہمیشہ سے اداکارہ ہی سمجھی گئیں پھر یکا یک رائٹر بن گئیں)

اریز احمد۔ ثنا عسکری۔ ہاشم خان۔ ثمینہ احمد۔ عائشہ گل۔ شمائل خان۔ یاسر شورو وغیرہ

میم سے محبت۔ اس ڈرامے کو لکھا ہے ہمسفر کی شہرت یافتہ فرحت اشتیاق نے اور اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ علی حسن۔ ہم ٹی وی جس نے گزشتہ دنوں اپنے قیام کے بیس برس پورے کئے ہیں۔ یہ بیس برس دراصل پاکستانی سماج کی ایسی تاریخ کہی جاسکتی ہے جسے تفریحات کے حوالے سے تنزلی اور زوال کی تاریخ کہنا چاہیے ۔ اسی سماجی انحطاط کا جشن گزشتہ دنوں منایا ہے ہم ٹی نے۔ میم سے محبت بھی ایک ایسی تاریخ کا نوحہ ہے جس کی تابانی میں نام لکھا ہوا ہے حسینہ معین کا۔ یہ مرحومہ پاکستانی ٹی وی ڈرامے کی ایسی غضب کی اسٹائلش ڈراما نویس رہی ہیں جن کے لکھے ہوئے ڈرامے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی نا صرف یاد کئے جاتے ہیں بلکہ کتنے ہی ایسے اداکار ہیں جن کی ناموری اور کامیابی کی داستان حسینہ معین کے

جویریہ نے زبان و بیان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی

لکھے ہوئے کرداروں سے شروع ہوتی ہے۔ حسینہ معین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں ڈرامے میں خواتین کے کرداروں کے حوالے سے حسینہ معین وہ واحد لکھنے والی رہی ہیں جنھوں نے عورت کی مظلومیت کے دعووں سے کبھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ عورت کے بے پناہ بہادر اور جرات کے پیکر کردار لکھتی

رہیں، حسینہ معین نے لڑکیوں کے کرداروں میں ایسے بے فکرے اور کسی بھی مشکل سے ٹکرانے والے کردار لکھنے سے شہرت حاصل کی ۔ آج تک ان کے کردار ایسے زندہ ہیں جیسے یہ کل کی بات ہو۔ کردار نگاری میں حسینہ کو جو ملکہ حاصل تھا اس میں ان کی انفرادیت کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

میم سے محبت دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے فرحت اشتیاق ۔ خود کو حسینہ معین کے نقش قدم پر چلانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسے کردار اور کہانیاں لکھ رہی ہیں جن میں ایسی کوئی انفرادیت نہیں ہے جس کے لئے ان کا نام لیا جانا ضروری ہو، حسینہ معین کے اسکول آف تھاٹ پر چلتے ہوئے ویسا ہی نام اور پہچان حاصل کرنا ایک الگ بات ہے، جس کی تعریف بھی کی جاسکتی ہے لیکن حسینہ معین کے کرداروں اور کہانیوں کا سرقہ کرکے ان جیسا کہلوانا کسی بھی طرح قابل فخر اور احسن عمل نہیں کہلا سکتا، فرحت اشتیاق اسی ناپسندیدہ عمل کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

میم سے محبت میں احد رضا ہیں جو اداکار آصف رضا کے فرزند ہیں اور مذکورہ ڈرامے میں دونوں حقیقی باپ بیٹے نے یہی کردار نبھائے ہیں جس نے ناظرین کو مسرت سے ہمکنار کرنے کے بجائے ایسی خفت سے دوچار کر دیا ہے کہ ان کے لئے اسے ہضم کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

دیگر فنکاروں میں شامل ہیں۔ دانا نیر مبین۔ (غالباً یہی بی بی اس ڈرامے کی نئی نکور ہیروئن ہیں) ضرار خان۔ خدیجہ سلیم۔ فائزہ گیلانی۔ تحسین وجاہت۔ رابعہ رضوان۔ زینب مظہر۔ نوین نقوی (ماضی کی اس اداکارہ کی واپسی نے صرف ایسی حیرت کو جنم دیا جس کے ساتھ افسوس بھی منسلک ہوتا ہے) ارشد محمود۔ (ایک بہت برے عہد میں ان کی واپسی بھی سوائے پرانی شہرت کے ٹکڑے کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔) اور توشیق حیدر۔

''اے عشق جنوں'' اے آر وائی سے پیش کیا جانے والا یہ ڈراما ماضی کے کئی ڈراموں کی کہانیوں اور کرداروں کو جوڑ توڑ کر بنایا اور لکھا گیا ہے۔ جیو سے عدیل رزاق کے لکھے ہوئے ڈرامے'' مشکل'' جس میں ہیرو کی وجہ سے رسوا ہونے والی لڑکی سے وہ بحالت مجبوری شادی کر لیتا ہے۔ (ایسا ہی ہوا ہے اے عشق جنوں میں) آسمانوں پر لکھا تھا۔ رابعہ رزاق کے اس ڈرامے میں شہر یار منور ایک حادثے میں جوش جذبات میں خود کو شادی کے لئے پیش کر دیتے ہیں حالانکہ ان کی منگنی اپنی پسند کی لڑکی سے پہلے ہی ہو چکی ہے۔ اے عشق جنوں میں بھی وہ ہی شہر یار منور ہیں جن کی پہلے سے اپنی پسند کی لڑکی سے منگنی ہو چکی ہے اس بار پھر انھوں نے جذبات کے اندھے بہاؤ میں اشنا شاہ سے شادی کر لی ہے۔ اے عشق جنوں کی لکھاری سعدیہ اختر ہیں جن پر ہمیشہ چوری کی کہانیوں کے الزامات لگتے رہے ہیں۔ ماضی میں وہ انڈیا کی ایک فلم انجام کو چھاپ چکی ہیں۔ اے عشق جنوں کے ڈائریکٹر قاسم علی مرید ہیں۔

ٹی وی ڈراموں کے موضوعات

"'اطراف' ٹی وی ڈراما مافیا کی تہذیب کشی۔ اقدار کے قتل عام کی مزاحمت میں سامنے آگیا ہے۔ اُردو زبان۔ ڈرامے کی تکنیک۔ مکالمات کی برجستگی کے حوالے سے ہم ڈراموں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس میں ہمیں جماعت اسلامی کے مرکزی میڈیا مانیٹرنگ سیل کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے۔ جہاں بہت غور سے باریک بینی سے ڈرامے دیکھے جاتے ہیں۔ پھر 'اطراف' کے لیے وہ رپورٹ بھی بڑی احتیاط سے تیار کر کے عنایت کرتے ہیں۔ آپ بھی اس کار خیر میں شریک ہوں۔ اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔"

بسمل۔ ہوس اور جذباتی عدم توازن کی منظر کشی

جماعت اسلامی کے مرکزی مانیٹرنگ سیل کی رپورٹ

بسمل

نصرت یوسف

بالآخر اڑتیس اقساط پر مشتمل سیریز کا اختتام ہوا اور دیکھنے والوں کی آہ اور واہ کا شور اونچا ہو کر قوم کے فکری معماروں کا رخ ظاہر کر چکا۔ فی زمانہ شوبز میڈیا سے بڑا اور پرکشش استاد انسان کے لیے کوئی نہیں جو ہر ایک کے لیے بنا تخصیص میسر ہو۔ اس ڈرامے میں مرد کی قوامیت، اسکی فکری اور جذباتی صلاحیت کو جس قدر کچل کر دکھایا گیا ہے وہ پورے معاشرتی نظام پر حملہ ہے۔ یہ حملے نئے نہیں لیکن اسکے ساتھ معاشی درجہ بندی کی ایک نئی تعریف بھی دی گئی۔ اچھے بھلے وسائل والے پاکستانی خاندان کو ندیدہ، کم ظرف، بیچارہ، تعلیمی پس ماندہ غرض ہر اخلاقی اور تخلیقی محاسن سے دور طبقہ دکھایا گیا۔ بات بات پر معاشی پس منظر اور اخلاق کا موازنہ کروایا گیا جو کہ حقیقی منظر نامہ سے دور تھا۔ معصومہ کی منفی سوچ کو معصومہ کے جیسے طبقہ کی کیفیت جتا کر احساس کمتری اور احساس برتری کو اس درجہ پر ابھارا گیا کہ ناظرین کے دل میں دولت ستار العیوب اور قاضی الحاجات سے بھی بلند دکھاتے زندگی کا قبلہ جتایا گیا۔ تعلیم تمیز اور تہذیب کثرت مال سے آتی ہے، یہ بات مختلف جذباتی مناظر دکھا کر ذہن نشین کرائی گئی۔ یہ درست ہے کہ وسائل کی کمی انسانوں کو مختلف اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کرتی ہے لیکن یہ ہی

دل ناداں۔ اور بجّو۔ امیر گھرانوں کی سازشی اور مکار عورتیں

بیماریاں وسائل کی کثرت سے بھی آتی ہیں۔ معصومہ کا کردار پاکستان کے مڈل کلاس گھرانے کا ہے جو اخلاقی لحاظ سے مجموعی طور پر بہتر ہوتے ہیں۔ انکو آگے بڑھنے کی خواہش تو ہوتی ہے لیکن ان میں بالعموم مادیت اور روحانیت ساتھ ساتھ نظر آجاتی ہے جو کثرت مال میں بالعموم کم پائی جاتی ہے۔ تو قیر تاثیر کا گھرانہ پیسہ سے اپنا ہر گناہ اور عیب دھونا چاہتا ہے، جب کہ معصومہ کے گھرانے میں اسکے والد کا مثبت کردار اور مکالمے تھے مگر وہ ابھارے نہیں گئے اور یوں پورا ڈرامہ ہوس اور جذباتی عدم توازن کی منظر کشی کرتا رہا۔

موجودہ ڈرامے اور معاشرتی اخلاقیات

ڈاکٹر عزیزہ انجم

اس وقت مختلف چینلز پر جو ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں ان میں موضوع کی اتنی یکسانیت ہے اور اتنی چیختی ہوئی اداکاری ہے کہ ڈرامے دیکھنا لطف سے زیادہ اذیت ہے۔ دل ناداں اور بجو ڈرامے میں بسمل کی طرح مڈل کلاس فیملی کو گھٹیا دکھایا گیا ہے۔ دل ناداں میں بھاوج کا کردار ایک بھونڈا کردار ہے۔ گنوار پھوہڑ اور گلے پھاڑ کر چیختی ہوء بھاوج نند اور ساس کے ساتھ بدتمیزی بھی کر رہی ہے اور لالچی بھی ہے۔ پاکستانی خاندانوں میں عموماً گھروں میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور ساس نند بھاوج ایک گھر میں رہتے ہیں۔ بھاوج کی تنک مزاجی اور بدتمیزی اور بدتہذیبی دکھانا معاشرے کی بدصورت عکاسی بھی ہے اور اخلاقی بدحالی کا سبق بھی۔ اسی طرح بجو میں ایک بہت بری مڈل کلاس فیملی دکھائی جا رہی ہے۔ بجو ایک بڑی عمر کی غیر شادی شدہ لڑکی ہے جو ٹک ٹاک پر

بیہودگی کر رہی ہے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہے جس سے سارے گھر والے نالاں اور پریشان ہیں۔ ماں اور بیٹا لب ولہجہ زبان اور طور طریقوں سے مہذب نظر آتے ہیں لیکن بہو کی زبان بگڑا ہوا بہاری لہجہ ہے اور بیٹے بہو کا کوء جوڑ بنتا نظر نہیں آتا۔ اور کسی بھی ثقافت کا اس کی زبان کا اس طرح مذاق اڑانا انتہائی نامناسب ہے۔

دونوں ڈراموں میں ایک اور پہلو جو نمایاں ہے وہ امیر گھرانوں کی سازشی اور مکار عورتیں ہیں۔ امیر گھرانے مڈل کلاس سے نہ صرف نفرت کرتے ہیں بلکہ بار بار مڈل کلاس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دل ناداں اور بجو دونوں ڈراموں میں بیٹے کے مڈل کلاس لڑکی کو پسند کرنے پر ماں آگ بگولہ ہو کر کہتی ہے تمہیں وہی گھٹیا مڈل کلاس پسند آئی ہے۔ یہ کونسا طرز تخاطب ہے اور کیا سوچ دی جا رہی ہے۔ چالیس پچاس قسطوں میں صرف اور صرف بنی ٹھنی ظاہری شان وشوکت دکھاتی خبیث اور مکار عورتیں ہیں اور بے وقوف مرد۔ اس کے ساتھ اب ڈراموں میں بدکاری کا الزام بھی عام ہو گیا ہے۔ سازشوں سیکسی بیوی اور بہو کو کسی مرد کے ساتھ دکھایا جاتا ہے اور شوہر صاحب کھڑے کھڑے ہاتھ پکڑ کر بیوی کو رات کی تاریکی میں گھر سے دھکے دے کر نکالتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں۔

ایک اور ڈرامہ جس کی آخری قسط اس ہفتے آجائے گی ایک بگڑی ہوئی امیر بیٹی دکھائی گئی۔ بیٹی کا لباس اس کا مزاج اس کی اٹھان سب برائی کی تصویر کشی ہے۔ باپ اور بیٹی ایک ہی جوڑے کے مرد اور عورت سے شادی کرتے ہیں بیٹی کی بدتمیزیاں اور سازشیں عروج پر ہیں۔ ایک ٹین ایج لڑکی اتنی فسادی کہ باپ بھی بے بس ہے۔ یہ ڈرامے دیکھنے والوں کو برائی دکھا رہے ہیں سکھا رہے ہیں۔ معاشرے کی اخلاقی قدریں برباد کر رہے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کی منفی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ڈرامہ عموماً ریلیکس ہونے کے لئے دیکھا جاتا ہے اور ہر عمر اور ہر طبقہ کے مرد عورت بچے سب دیکھتے ہیں۔ ایک طرف اخلاقی زوال دوسری طرف معاشرے کے مختلف طبقات میں نفرت اور فاصلے ہماری زندگی ہماری تہذیب برباد کر دیں گے۔ پہلے ہی محبت اور رواداری کی کمی ہے اسے اور بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا انٹرٹینمنٹ یہی ہے۔ اور کیا ڈراموں میں کوئی اچھی پر لطف چیز نہیں دکھائی جا سکتی جو دیکھنے والوں کو سکون بھی دے اور کچھ اچھے اور مثبت رویے بھی سکھائے؟

اُردو، اداکاروں کے نرغے میں

نیر کاشف

گو کہ ہم ڈرامے دیکھنے کا کشٹ تو مواد پر نظر رکھنے کی غرض سے

چینل مالکان۔ ہدایت کار۔ مصنّف
اداکار۔ سب زبان کی حفاظت سے غافل

اٹھاتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ آج کے ڈرامے جہاں اقدار و روایات پر ضرب لگا رہے ہیں وہیں اردو زبان کو خوب چوٹ پہنچا رہے ہیں۔ سنتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب ٹی وی ڈرامہ میں کام کرنے والے اداکار اور اداکاراؤں کو تلفظ غلط ہونے پر ہدایت کار سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب تو حال یہ ہے کہ اکثر ڈراموں کے ثانوی کردار جب کہ کچھ ڈراموں کے تو مرکزی کردار بھی "غ" کو "گ" اور "خ" کو "کھ" میں بدل کر پورے پورے جملے ادا کر جاتے ہیں اور ڈرامہ جانے کتنے ہاتھوں سے گزر کر آن ائیر بھی چلا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جملوں میں کلیدی لفظ غائب ہوتا ہے اور کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج کے ڈراموں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار کی اجازت کے بغیر مکالموں میں تبدیلی کرنا عام ہو گیا ہے کیونکہ جس قسم کے سطحی مکالمے سننے کو ملتے ہیں، ایک لکھنے والے سے ایسے جملوں کی توقع تو ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ کچھ انٹرویوز دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کچھ اداکار سیٹ پر مناظر میں تبدیلی لانے کے لیئے عین موقع پر خود مکالمے لکھنے کی ذمے داری بھی ادا کرتے ہیں۔ خدا جانے قومی زبان کے ساتھ اس ناروا سلوک کے خلاف قدم اٹھانا کس کے اختیار میں ہے، پیمرا تو اپنے اصل فرائض سے بھی غافل ہے، زبان و بیان کا خیال تو پھر ان کے لیئے اضافی کام ہے۔ ایک اور حیرت انگیز بات مکالموں کے درمیان انگریزی الفاظ اور بعض اوقات پورے پورے انگریزی جملوں کا بے دھڑک استعمال ہے۔ ناگزیر حد تک انگریزی الفاظ کا استعمال سمجھ میں آتا ہے، لیکن ان ڈراموں کو دیکھ کر ناظر یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ یا تو ڈرامے ہدایتکار اور اداکار خود مل جل کر لکھ رہے ہیں، یا پھر ڈرامہ نگار کے پاس کہانی اور پلاٹ کے نام پر تو شاید کافی کچھ ہے لیکن لسانی و ادبی مہارتوں سے ان کا بھی دامن خالی ہے۔

ایک وقت تھا کہ اردو زبان کی خدمت میں ٹی وی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور آج اردو زبان کا بیڑہ غرق کرنے میں اسی ٹی وی کا کردار نمایاں ترین ہے، حالانکہ آج، جب کہ کتابیں پڑھنے کا رجحان بھی تشویشناک حد تک کم ہوتا جا رہا ہے، زبان کی حفاظت کے لیئے ٹی وی کی ذمہ داری میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے، لیکن افسوس چینل مالکان، ہدایتکار، مصنفین اور اداکار، سب ہی اس ذمہ داری سے غافل ہیں۔

زباں تو بگڑ چلی ہے، لیکن راقم الحراف یہ پتہ لگانے سے قاصر ہے کہ خبر لینے کی گزارش کس سے کی جائے۔ ❁

سوشل میڈیا پر آپ کتنا وقت گزارتے ہیں؟

Monthly
ATRAAF
A MAGAZINE - A THINK TANK
Bridging Extremes

اطراف

سوشل میڈیا اور آپ

والسلام

محمود شام

Address: A-282, Block3, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.
0300-8210636 mahmoodshaam@gmail.com www.atraafmagazine.com

'اطراف' عالمگیر سروے

ماہنامہ 'اطراف' کو یہ فخر اور اختصاص حاصل ہے کہ وہ معاشرے کو درپیش مسائل پر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے خواتین وحضرات سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ان احباب کا شکریہ کہ وہ وقت نکال کر 'اطراف' کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ اس سے ہمیں اندازہ رہتا ہے کہ دنیا کس طرف جارہی ہے۔

کوشش کی جاتی ہے کہ ان احباب میں کاروباری لوگ بھی ہوں۔اساتذہ بھی۔ادیب۔شاعر اور طلبہ وطالبات بھی۔

سوشل میڈیا اس وقت اطلاع اور معلومات کا سب سے اہم مرکزی اور حساس ذریعہ ہے ہر روز نئے نئے آلات سامنے آرہے ہیں۔اور یہ سب کچھ اسمارٹ فون میں دستیاب ہے۔ پاکستان کے 24 کروڑ لوگوں میں سے 18 کروڑ کے پاس فون ہیں۔ان میں اکثریت اسمارٹ فونوں کی ہے۔

ہمارے 15 سوالات کے جوابات میں ان خواتین وحضرات کے معمولات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سوشل میڈیا کا استعمال معاشرے کو کس طرف لے جارہا ہے۔خوشی کی بات ہے کہ زیادہ تر رائے سوشل میڈیا کے حق میں ہے۔سب کا یہ کہنا ہے کہ یہ استعمال کنندہ پر منحصر ہے کہ وہ ایک ایجاد کا استعمال منفی کرتا ہے یا مثبت۔ یہ 'سوشل میڈیا' ایک اہم شعبہ بھی ہے اور حساس بھی۔اس لیے آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کرسکتے ہیں۔ فون: 0300-8210636

علم۔ادب۔سیاست۔سماج۔ثقافت۔موسیقی اور سائنس سے متعلقہ شعبے۔**پناہ بلوچ کوئٹہ**

سوشل میڈیا کو وقت دینے سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔
محمد ثاقب کراچی

اعتدال ہے تو سب اچھا۔بے جا استعمال وقت کا ضیاع۔
ڈاکٹر ایمن وردہ۔حیدر آباد

سائبر جرائم سے آگاہ رہیں تو اینڈرائڈ کا بہتر استعمال کرسکتے ہیں۔
محمد حسین، پروگرام منیجر۔ریڈیو پاکستان حیدر آباد

موبائل فون اب 'لائف پارٹنر' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔
گل بانو۔کراچی

یوٹیوب پر سلائی، چائنیز کھانے، صحت سے متعلق وڈیوز پر ریسرچ۔
نازیہ آصف، گجرات

رات ایک گھنٹہ تو وہ وڈیوز جن کا تعلق قدیم وجدید تاریخ سے ہو۔
ڈاکٹر انعام الحق جاوید، اسلام آباد

صبح نماز فجر کے بعد قریباً ڈیڑھ سو پیغام السلام علیکم۔صبح بخیر۔اور گڈ مارننگ کے۔
ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم۔لاہور

سوشل میڈیا کے ذریعے نوجوان گھر بیٹھے کاروبار کر رہے ہیں۔
پروفیسر شاداب احمد صدیقی۔ حیدر آباد

عصر حاضر کی اہم ضرورت۔مگر بے جا استعمال نقصان دہ۔
ڈاکٹر عنبر عابد۔ بھوپال (انڈیا)

معلومات اُدھوری اور مبالغے کا غلبہ۔
سلیم منصور خالد۔ لاہور

میری بیگم دیکھتی ہیں کہ بچے صحیح استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔
محمد شاکر حسین۔ حیدر آباد

اس کے استعمال سے وقت بچتا ہے۔سب کچھ اس میں محفوظ کر لیتی ہوں۔
عطیہ حسن۔ کراچی

جنوبی ایشیا کے لوگ ہر ایجاد کے منفی پہلو کو اپناتے ہیں

پناہ بلوچ، کوئٹہ۔مصنّف۔دانشور

1_Samsung......A 34
2۔فیس بک ، مسینجر ، واٹس اپ ، جی میل ، گوگل ، ٹِک ٹاک ، انسٹا گرام ، سیم سنگ نوٹ ، چیٹ جی پی ٹی ، مائیکروسوفٹ ، گوگل میپ ، کلینڈر ، گوگل پلے ، کیلکیو لیٹر ، گوگل فوٹو ، نیٹفلیکس ، کیپ کٹ ، یوٹیوب میوزک ، پلے اسٹور ، مائی ٹیلینور ، مائی زونگ ، ریختہ ، گلوبل گولز ، گیمنگ حب ، ینڈرائیو ، کریم ، یانگو ، بلوچی اکیڈمی ، این بی پی ڈجیٹل ، وڈ میٹ ، ایس ایل اے لغات ، آف لائین اردو لغات ، اوایل ایکس ، زمین ڈاٹ ، رابطہ ، سپوٹیفائی۔
3۔پندرہ سے بیس منٹ ، لائیک دس سے بیس ، کمنٹس بھی دس سے بیس۔ 4۔علمی ، ادبی ، سیاسی ، سماجی شعبہ جات کے متعلق اور ادبی و ثقافتی تقریبات۔
5۔آدھا گھنٹے سے کم ، کبھی کبھار فلم ، ڈاکومنٹری وغیرہ کے دیکھتے ہوئے زیادہ بھی۔علمی ، ادبی ، سیاسی ، سماجی ، ثقافتی اور سائنسی۔ 6۔علم ، ادب ، ثقافت ، سماجیات ، سیاسیات اور سائنس سے تعلق رکھنے والے۔
7۔کبھی کبھار 8۔زیادہ تر 9۔علم ، ادب ، سیاست ، سماج ، ثقافت ، موسیقی اور سائنس کے شعبہ جات۔ 10۔علم ، ادب ، سیاست ، سماج ، ثقافت ، موسیقی اور سائنس سے تعلق رکھنے والے۔ 11۔پانچ سے چھ گھنٹے 12۔کبھی کبھار 13۔کبھی کبھار 14۔لگ بھگ ساٹھ
15۔اسمارٹ فون نے نت نئی ٹیکنالوجی اور جدید علوم کے یلغار کے ذریعے پوری دنیا کو انسان کے ہاتھ میں سمو دیا ہے۔اس یلغار نے انسان پر منفی اور مثبت یعنی دونوں اثرات مرتب کئے ہیں۔لیکن پسماندہ ، ناخواندہ اور ترقی پذیر سماج اس سے زیادہ متاثر دکھائی دیتے ہیں۔انگریزی کا محاورہ ہے کہ Excess of everything is bad بدقسمتی سے جنوبی ایشیا اور خاص کر ترقی پذیر ممالک کے لوگوں نے قسم اٹھا رکھی ہے وہ کسی بھی جدت پسندی کے عمل اور تبدیلی کے مثبت پہلوؤں کی جانب راغب ہونے کے بجائے ان کے منفی پہلوؤں سے رجوع کریں گے۔
اسمارٹ فون کی آمد نے جدید علوم اور معلومات کے فراہمی کے انگنت در وا کئے ہیں، تعلیمی اداروں ، سماجی اداروں ، مالیاتی اداروں سے لے کر بنیادی سہولتوں کے ادارے ہسپتال ، دفاتر ، شاپنگ مال یعنی انسانی زندگی سے جڑے ہر پہلو کی معلومات اور سرگرمیاں آپ کی انگلیوں کے تابع دکھائی دے رہے ہیں۔اس غیر متوقع انقلاب نے ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کی زندگی میں طوفان برپا کر دیا ہے۔ایک مخصوص آبادی پر مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں اور انہوں نے اس کے ذریعے اپنی زندگی میں سماجی ، معاشی ، ثقافتی اور روزمرہ معمولات میں آسانیاں پیدا کرنے کے رموز جان لئے ہیں اور بھاگم بھاگ کے دور میں ایک کلک پر اپنے کام سرانجام دے رہے ہیں۔دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی کے اس آلے کو غلط استعمال کرنے والے طبقے نے دھوکہ دہی کے ذریعے سادہ لوح انسانوں کی زندگیوں میں زہر گھولنے کا کام بھی کیا ہے جس کے باعث ان گنت غیر اخلاقی واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ سرکار ، موبائل کمپنیاں ، تعلیمی ، سماجی ، سیاسی اور ثقافتی ادارے ان جدید آلات کے استعمال کے دوران اخلاقیات کی آگہی کی مہم کو عام کریں اور اس کے مثبت پہلوؤں اجاگر کریں اور منفی پہلوؤں کے مضمرات عام کریں۔

فیس بک پر دو گھنٹے۔ زیادہ تر ذہنی سائنسی علوم

محمد ثاقب، کراچی کالم نویس۔ محقق

1۔ Samsung Galaxy-A-12S 2۔ واٹس ایپ۔ فیس بک۔ کیم اسکینر 3۔ دو گھنٹے۔ دس تبصرے۔ بزنس کے مقصد کے لیے
4۔ ٹوئٹر زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ 5۔ ایک سے پانچ گھنٹے۔ موسیقی۔ دماغی سائنس۔ اپنی مدد 6۔ جاوید چوہدری۔ ذیشان عثمانی۔ سونو شرما
7۔ نہیں بالکل نہیں۔ 8۔ نئی سائنسی ایجادات میں جیمز ویب اور دوسروں کی دریافت کا مشاہدہ۔ 9۔ ویب سائٹ میں ذہنی صحت۔ اپنی مدد
10۔ گوگل۔ ذہنی سائنسی علوم۔ تربیت۔ اپنی مدد پر تحقیق 11۔ تین گھنٹے۔ 12۔ نہیں 13۔ بچے نہیں ہیں۔
14۔ دس گروپوں کا ممبر 15۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

خصوصی معالج، اپنے شعبے سے متعلقہ ویب سائٹس ہمیشہ کھلی رہتی ہیں

ڈاکٹر ایمن وردہ۔ حیدرآباد

1- میں آئی فون استعمال کرتی ہوں۔ 2- ایک دُرماٹولوجسٹ ہونے کی حیثیت سے کچھ فیلڈ کے حوالے سے ویب سائٹس کھلی رہتی ہیں اور فیملی فرینڈز کے ساتھ رابطے کے لیے واٹس ایپ۔
3- فیس بک پروفیشنل پیج ہے، اکثر update کرتی ہوں لیکن likes اور comments بہت کم۔ 4- ٹوئٹر بالکل استعمال نہیں کرتی۔
5- یوٹیوب کا استعمال بھی نہ ہونے کے برابر۔ 9- ویب سائٹ اپنی فیلڈ کے حساب سے۔ نئی dermatologist ریسرچ جاننا پسند ہے اور ضروری بھی۔
11- دن میں دو سے تین گھنٹے زیادہ سے زیادہ۔ جس میں فیملی سے رابطے میں رہنے والا دورانیہ بھی شامل ہے۔
12- جی کبھی کبھی بچے استعمال کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی assignments اور اسکول کے circulars بھی websites اور Whatsapp پر ہی آتے ہیں لیکن فون کے لیے تفریح کا ذریعہ نہ بنے، یہ کوشش رہتی ہے۔ 13- جی بالکل، نگرانی فون، ٹی وی دونوں کی ہی ہونی چاہئے۔ 14- فیملی، دوست احباب اور اپنے شعبے کے کچھ گروپوں کی ممبر ہوں۔
15- اعتدال ہو تو اچھا اور فائدہ مند ہے۔ اور غیر ضروری استعمال، بے جا استعمال تو یقیناً وقت کا ضیاع ہے۔
(یہ جائزہ 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی پروفیسر شاداب احمد صدیقی کے ذریعے موصول ہوا)

گوگل پر خبروں۔ تاریخ اور اسپورٹس کی تلاش جاری رہتی ہے

محمد حسین پروگرام مینیجر ریڈیو پاکستان حیدرآباد

1۔ سام سنگ، اینڈرائڈ 2۔ واٹس اپ، فیس بک، ٹیوٹر، انسٹا گرام۔ 3۔ مختلف اوقات میں ایک گھنٹہ دن میں دو تین لائک اور دو تین کمنٹس۔ 4۔ حالات حاضرہ سے آگاہی خود ٹیوٹر پر پوسٹ نہیں کرتا۔ 5. یوٹیوب پر کبھی کبھار مووی دیکھتا ہوں۔ 6۔ کسی چینل کو نہیں۔ 7. جی ہاں سیاسی صورتحال اتنی تیزی سے بدلتی ہے خبروں کی تلاش رہتی ہے۔
8۔ نہیں 9 ادب سے منسلک ویب، نیوز ویب، یا سماجی مسائل سے منسلک ویب کا دیکھنا ہوتا ہے 10.. گوگل پر نیوز، تاریخ، اور اسپورٹس کی سرچ جاری رہتی ہے۔

11 تین سے چار گھنٹے 12.. جی ہاں اپنی نگرانی میں 13.. جی ہاں 14.. واٹس اپ پر تقریباً 15 گروپ میں شامل ہوں

15. یہ ایک بہترین چیز ہے انسان اطلاعات کے ساتھ لوگوں سے منسلک رہتا ہے۔ یہ خود پر منحصر ہے کہ اس موبائل سے کیا کام لینا ہے ہر شخص اپنے رجحان کے مطابق اس کا استعمال کر سکتا ہے صرف احتیاط یہ کرنی ہے کہ بچوں کو اپنی نگرانی میں استعمال کروائیں، کسی کی دل آزاری کا سبب نہ بنیں اگر کہیں آپ کے عقیدے یا رجحان کے خلاف پوسٹ ہو تو اس کا جذباتی انداز میں جواب نہ دیں درگذر کریں۔ سائبر کرائم سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ ان باتوں پر عمل کر کے ہم اینڈرائڈ فون کا بہتر طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

(یہ جائزہ بھی حیدر آباد میں 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی پروفیسر شاداب احمد صدیقی کے توسط سے موصول ہوا)

شادی بیاہ کے معاملات بھی اب اس پر طے ہونے لگے

گل بانو۔ کراچی مصنّفہ، ناول نگار

موبائل فون اب ہمارے لائف پارٹنر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ہر پل ہر لمحے اس کا ساتھ ضروری محسوس ہوتا ہے۔ کہ نہ جانے کس وقت ضروری پیغام یا پھر فون آ جائے۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ جیسے بچے کا پیمپر بار بار کھول کر دیکھنا پڑتا ہے کہ "کچھ آیا تو نہیں" خیر مذاق برطرف لیکن اب موبائل فون ہماری زندگیوں کا لازمی جز بن چکا ہے۔ اور کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے ہم ساری دنیا سے جڑے رہتے ہیں۔ پہلے صرف فون ہوا کرتے تھے اب ہر طرف اینڈرائڈ کی بہار ہے۔ پیغام نہ صرف پڑھا اور سنا جا سکتا ہے بلکہ دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ گھر بیٹھے دنیا بھر کی سیر ہو جاتی ہے۔ معلومات کا خزانہ اب ایک انگلی کی چابی سے کھل کر آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا ہے۔ لائیو وڈیو کے ذریعے فوراً ہی کسی محفل میں پہنچا جا سکتا ہے۔ خبریں بھی بروقت ملنے لگی ہیں۔ ادھر کوئی وقوعہ یا حادثہ درپیش ہوا ادھر اس کی وڈیو پھیل گئی۔ اب چوروں کو بھی مور پڑنے لگے۔ سیاستدانوں کی خوب بھد اڑ رہی ہے کہ پہلے ٹی وی چینلز کی پابندیوں کے باعث کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ اب ہر یوٹیوبران کے پرخچے اڑا رہا ہے۔ ویسے اتنی آزادی بھی سمِ قاتل ہوتی ہے۔ کہ جب جس کی بھی چاہا مٹی پلید کر دی۔ جھوٹ سچ کی پرکھ مشکل بھی ہوتی جا رہی ہے۔

بیوی کی طرح ایک موبائل فون بیک وقت کئی کام سرانجام دے رہا ہے۔ صبح الارم بجا کر جگاتا ہے۔ پھر آفس میٹنگ الرٹ دیتا ہے میٹنگ کی تفصیل جو پچھلے دن فیڈ کی ہوتی ہے۔ اس کا چارٹ سامنے لا کر آج کے کام کی یاددہانی کرواتا ہے۔ آپ کی غیر موجودگی میں گھر کی حفاظت کا ذمہ بھی اس کے سر ہے۔ کھانا آرڈر کرنا ہو یا سودا سلف لانا ہو یہ کام بھی اب موبائل کے مرہون منت ہے۔ کام والی جس دن ناغہ کرے تو اطلاعی میسج موصول ہو جاتا ہے کہ آج اپنی جھاڑ پونچھ خود کر لو۔

جب اچانک بہت سے مہمان آ جائیں تو کھانا پکانے کی زحمت اٹھانے کے بجائے جھٹ پٹ آرڈر دے کر ان کی مدارات کا لطف اٹھائیں۔ کیک، پیزا، آئسکریم بلکہ اب تو سردیوں میں مونگ پھلی، تل کے لڈو اور گزک بھی آپ کے در دولت پہ دستک دیتی ہے بس ایک کلک ہی تو کرنا ہے۔

بچوں کے اسکول کا ہوم ورک بھی اب موبائل کے صدقے آسان ہوا۔ کرونا جیسی وبا میں بچے اسی موبائل اور انٹرنیٹ کے محتاج تھے۔ اب بھی اسکول کی ڈائری اور چھٹیوں کا کام موبائل فون پر رسیو کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات بھی اب موبائل فون پر طے ہونے لگے ہیں۔ ادھر سے لڑکی کی تصویر آئی لڑکے نے پسند کیا اور لو جی طے ہو گئی شادی۔

میاں بیوی اور ساس بہو میں سرد جنگ کچھ یوں چھڑتی ہے۔ بہو نے پوسٹ ڈالی "کل میں نے باربی کیو پیزا بنایا تھا سب کو بہت پسند آیا"۔ ساس نے پڑھ کر یوں منہ بسورا ہونہہ سارا کا سارا جل گیا تھا اتنا بدمزہ تھا افففف توبہ تصویر تو دیکھو صرف اوپر سے لے کر ڈال دی۔۔۔ اب لوگوں کو اصل معاملے کا کیا پتا۔۔۔ کمنٹ میں لکھا "ہاں اچھا ہوتا اگر۔۔۔۔" "بس یہی کمنٹ جلتی پر تیل کا کام کر جاتا ہے۔۔۔۔

تو جناب موبائل ہماری زندگیوں میں ہر طرح سے شامل ہو چکا ہے۔ کیا خوشی کیا غمی۔۔۔ آپ خوش ہوتے ہیں تو سب سے پہلے اپنا اسٹیٹس اپ ڈیٹ کرتے ہیں۔ جیسے کہ بیگم کی وفات ہوتے ہی سنگل کا اسٹیٹس آ جاتا ہے۔۔۔ یعنی چڑیوں کے لئے در کھلا ہے۔ ادھر بیوی اگر بیوہ ہو جائے تو بھی اپنا دکھڑا فیس پر ضرور روتی ہے۔ اماں نے ٹنڈے پکائے تو بھی اسٹیٹس اپ ڈیٹ ہوتا ہے اور کئی لڑکے لڑکیاں آنسو پونچھنے آ جاتے ہیں۔ بچے دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے فیس بک پر وارد ہوتے ہیں پھر نانی، دادی پھوپھیاں۔ خالائیں دیکھتی ہیں۔

یعنی گود میں ہی امریکہ کا پھیرا لگا آتے ہیں پھر پاکستان میں آنکھ کھولتے ہیں۔

اور جب آنکھ کھلتی ہے تو کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔ کہ میں تو عالمِ بالا سے پرسکون ماحول سے آیا تھا یہاں تو ایک ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ پھر وہ اس ہڑبونگ کا عادی ہو جاتا ہے۔ عادی مجرم ہو جیسے۔

موبائل کے ساتھ جینا بھی مشکل اس کے بغیر رہنا بھی۔۔۔ تو اب یہ زندگی کے ہر پل کا ساتھی ہے۔ تو فکر کاہے کی جیوو جیسے جی چاہے۔

میرا موبائیل میرے بچے استعمال کرتے ہیں

نازیہ آصف، گجرات مصنّفہ۔کالم نویس۔سماجی تجزیہ کار

ایک بار میرے بیٹے نے مجھ سے پوچھا" ماما! جب آپ کے بچپن میں وائی فائی نہیں تھا تو آپ کیا کرتے تھے"؟۔
میں نے جواب دیا" بیٹے ہم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے ہمیں ایسی چیزوں سے فرق نہیں پڑتا تھا"۔
بیٹا بہت حیران ہوا اور پریشان ہو کر مزید پوچھنے لگا
واؤ، تو ماما آپ لوگ آپس میں کیا باتیں کرتے تھے؟
یہ مختصر مکالمہ تھا۔ پچھلی اور اگلی نسل کے درمیاں، جو اسے بہت حیران کر رہا تھا۔ گو کہ یہ ایک مختصر سا مکالمہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ ہماری اگلی نسل کا مجموعی رویہ بھی یہی ہے۔ ان کے نزدیک آپس میں باتیں کرنے کے لیے بھی گویا کسی ٹاپک کا ہونا ضروری تھا۔
ہم بچپن میں کہیں ایک بار جاتے تو سارا راستہ یاد کر لیتے، دوسری بار جانے کے لیے کبھی کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اب کے نوجوان کے پاس گوگل میپ نہ ہو تو دوسری کیا چوتھی بار بھی پتہ نہ ہو کہ کس طرف جانا ہے۔
قصور نوجوانوں کا بھی نہیں، گھر سے باہر کتنے گراؤنڈ کتنے پارکس ہیں جہاں جا کر وہ کسی جسمانی سرگرمی میں حصہ لے سکیں، جم خانے موجود ہیں مگر ان کی فیسیں ہر نوجوان کی قوت سے باہر ہیں۔ اپنی بات کروں تو پچھلی صدی سے تعلق ہونے کے باوجود بھی میرا ہر دوسرے کام کا تعلق بھی موبائل ہی سے نکل آتا ہے۔ لکھنے کے لیے کبھی کاغذ استعمال ہوتا تھا مگر اب تو میں بھی کاپی رجسٹر کی جگہ اپنا y17s موبائل ہی استعمال کرتی ہوں۔ کون بار بار کاغذ پہ لکھے اور پھر اسے موبائل یا لیپ ٹاپ پہ کمپوز کرنے کی مشقت بھی اُٹھائے۔ جس میں بہت سہولت بھی ہوتی ہے مگر ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ نے کچھ لکھنا شروع کیا اور کچھ تھوڑا بہت بھی ریسرچ کرنے کی غرض سے یوٹیوب یا گوگل کھول لیا تو واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی مال میں جا کر اتنے سارے خوبصورت ڈیزائن اور رنگ دیکھ کر خواتین جوڑے خریدتے ہوئے شش و پنج میں مبتلا ہو جاتی ہیں ایک سے بڑھ کر ایک چیز نظر آتی ہے، اور یوں اکثر تھوڑا سا لکھنے میں بھی کتنا طویل وقت ہی لگ جاتا ہے۔
ہماری بزرگ خواتین کے پاس کتنا وقت تھا اور وہ گھر داری کے علاوہ بھی کتنے مشاغل رکھتی تھیں جیسے کہ سلائی، کڑھائی، کروشیا، چارپائی بننا، رت بدلتے ہی رضائیاں گدے تیار کرنا، گھروں میں چونا کرنا، مگر اب اس موبائل نے وقت پہ ایسا کٹ لگایا ہے کہ ہر دوسری خاتون خانہ یہ کہہ رہی کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ جبکہ اب گھر پکے، کپڑے ریڈی میڈ، چونے کی جگہ پینٹ اور وال پیپر لے چکا۔
وجہ موبائل پہ موجود ان گنت ایپس ہیں۔ جن میں سرفہرست فیسبک، انسٹا گرام، یوٹیوب اور واٹس ایپ ہیں۔ واٹس ایپ پہ چلنے والی طویل گلہ گزاریاں، گپ شپ، یا دوستوں کی گروپ کالز میں وقت لگ جاتا ہے۔ ان سے بھی آسودگی تو حاصل ہوتی ہے مگر شائد بہت کم۔
مندرجہ بالا مصروفیات خواتین کے تخلیقی مشاغل بھی تھے۔ جن کے مکمل ہونے پہ ایک خوشی و سرشاری اور ایک روحانی آسودگی میسر آتی، جو صحت پہ مثبت اثرات ڈالتی تھی۔ مگر اب سچ پوچھیے تو اس گلوبل گاؤں کی آبادی اتنی زیادہ اور شریر ہو چکی ہے کہ ہر گھنٹے ایک نیا ایشو تیار کیا ہوتا ہے۔ آپ نے ایک بار فیسبک کھول لی، جلدی بھی کرو تو آدھا پونا گھنٹا تو آپ لگا کر ہی اٹھتے ہیں۔ میری دلچسپی عموماً علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی اور سیاحتی پوسٹس ہوتی ہیں۔ جن پہ کچھ نہ کچھ رائے دیے بنا گزرنا مشکل ہوتا ہے۔ البتہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ مذہبی اور سیاسی تحریروں سے بچا جائے کیونکہ ان دونوں چیزوں پہ رائے دینا اوکھلی میں سر دینے کے مترادف بن چکا ہے۔ یعنی ''جس کو ہو جان و دل عزیز وہ اس گلی میں جائے کیوں۔۔۔۔''
ویسے سیانے کہتے ہیں کہ ایک ادیب یا ادیبہ کو سیاست سے دور رہنا چاہیے مگر میرا خیال ہے کہ ادیب ایک حساس دل انسان ہوتا ہے وہ۔ کی محبت اس کے دل میں بھی موجزن ہوتی ہے اور اس کی قلم کی زبان بھی دوسروں کی زبان سے کچھ تیز ہی ہوتی ہے تو وہ بھلا کیونکر خاموش رہ سکتا ہے
تاریخ، سیاحت، علمی و ادبی تحریریں تر و تازہ کر دیتی ہیں کوشش یہی ہوتی ہے کہ ایسے دوستوں کو ہی اپنی فرینڈ لسٹ میں جگہ دی جائے۔
موبائل کی دنیا میں ایک اہم ترین ایپ یوٹیوب ہے۔ جس میں آپ علاقائی سے لے کر بین البراعظمی کھانوں کی تراکیب، سلائی کڑھائی سے لے کر بم بنانے کی تراکیب تک سیکھ سکتے ہیں۔ میری دوسری زیادہ تر استعمال ہونے والی ایپ بھی یوٹیوب ہی ہے۔ میں یوٹیوب پہ سلائی کرنا، چائینز اور دوسرے کھانے، ساؤتھ انڈین اور تاریخ پہ مبنی موویز یا پھر صحت سے متعلق ویڈیوز ریسرچ کرتی ہوں اس کے علاوہ ہمارے گھر بھر کی مشترکہ پسند ٹریول ویلاگز ہوتے ہیں۔ جن سے ہم دنیا بھر کی سیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹریول ویلاگ میں Wild lense by Ibrar
اور اسی قماش کے کچھ اور ٹریول ویلاگز دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گوگل استعمال کرتی ہوں۔ چونکہ لکھنے پڑھنے سے تعلق ہے تو زیادہ تر ریسرچ کے لیے ہی گوگل استعمال کیا جاتا ہے عموماً تاریخ یا اردو ادب سے متعلق معلومات کے لیے اس طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اردو ادب سے متعلق ویب سائٹس بھی استعمال کرتی ہوں جیسے پریس فار پیس فاؤنڈیشن، اردو ڈاٹ کام یا پھر مختلف روزناموں کی ویب سائٹس جن

کے سنڈے میگزینز میں میری تخلیقات جگہ پا چکی ہوتی ہیں۔ ویسے تو سائنس کی دنیا میں جو چیز بھی ایجاد ہوئی اس کے منفی اور مثبت پہلو دونوں ہوتے تھے، مگر یہ موبائل ایک ایسی ایجاد ہے کہ جس نے عصر حاضر کی متعدد ایجادات کو ہڑپ کر کے وجود پایا ہے اس لیے اس کے مضر اثرات بھی اتنے ہی زیادہ ہیں۔ یہ موبائل اب سادہ موبائل نہیں بلکہ نشہ بن چکا ہے۔ آپ نے لکھنا ہے پڑھنا ہے، ریسرچ کرنی ہے، کاروبار کرنا ہے، بل پے کرنا ہے، دوستوں سے گپ شپ کرنی ہے، سفر کے لیے ٹکٹ درکار ہے، کسی ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ لینی ہے، کہیں جانے کے لیے راستہ معلوم کرنا ہے، نئی ریسپی کی تلاش ہے، مطلب یہ کہ آپ جدھر سے دنیا گھوم کے آئیں گے گھنٹہ گھر کی طرح سامنے آپ کے موبائل ہی ہوگا۔

اور ظاہری سی بات ہے کہ جب اتنے سارے کام آپ اس بالشت بھر کی ایجاد سے لیں گے تو آپ اسے کیونکر ہاتھ سے رکھ پائیں گے۔ موبائل زندگی میں آسانیاں تو لایا ہے مگر عوام کو ست و کاہل بھی بنا دیا ہے ہمیں چلنے پھرنے گھومنے کی عادت ہی نہیں رہ رہی جو بیماریوں کو جنم دے رہی ہے۔

جب گھر میں بڑے اتنے کام موبائل سے کر رہے ہوں تو بھلا بچے کیونکر پیچھے رہ سکتے ہیں۔ جیسے ہی موبائل کہیں پڑا دیکھا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی اسے اٹھا کر دیکھنا پسند کرے گا۔ نوجوان بچوں کا تو خیر کیا کہنا، وہ تو بڑوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں انھیں موبائل کے ان فنکشنز کا بھی پتہ ہوتا ہے جو والدین کو سالہا سال استعمال کرنے کے بعد بھی معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ماں تو ماں ہوتی ہے جس کی ایک آنکھ بچوں کے موبائل پہ تو دوسری ان کے ابا کے موبائل کی سکرین پہ ہوتی ہے۔

مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ ہماری نئی نسل کو ہو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی ایسی بھیانک شکلوں والے واہیات کارٹون کیریکٹر انھیں پسند ہیں۔ کسی بھی نوجوان کی پروفائل فوٹو دیکھیے ایسی فضول اور بدصورت سی تصویر ہوگی کہ خدا کی پناہ، ایسی تصویریں جن میں خوبصورتی، پاکیزگی ہے نہ کوئی موٹیویشن ہے بس عجیب وغریب سی تصویر ہوگی۔ کہتے ہیں کسی کی پسند سے اس کی شخصیت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے اب ایسی تصاویر کو دیکھ کر تو بچوں کے منتشر زین کا خیال ہی دماغ میں آتا ہے۔

نسبتاً بڑے بچے جو کالجز یا یونیورسٹیز میں پڑھ رہے ہیں ان کے ہاتھ سے بھی کتاب ناپید ہو چکی ہے ان کا سارے کا سارا علم بھی ایک لیپ ٹاپ میں سما چکا ہے۔

ایک ہم لوگ تھے ہفتوں لائبریری میں خوار ہوتے، اپنے مطلوبہ مواد کے لیے، درجنوں کتابیں چھان مارتے پھر کہیں جا کر کامیابی ملتی، آج کا طالب علم کم وقت میں سب کچھ نبٹا لیتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اس طرح سے ذہنی مشقت کم ہو جاتی ہے جس سے دماغ بھی ست ہو جاتا ہے۔ بہرحال جدید ایجادات انسان کے استعمال کے لیے بنی ہیں تو انسان کو استعمال کرنی چاہییں مگر ایسے نہیں کی وہ جذبات سے عاری ایک مشین ہی بنتا جائے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارا بہت سارا وقت اسی جادو کے کھلونے سے جادوگریاں کرتے ہوئے ہی گزر رہا ہے۔

آجکل ہمارے معاشرے میں ایک مخصوص لفظ" پرائیویسی" بڑی خوبصورتی سے فروغ پا رہا ہے، والدین کی پرائیویسی تو سمجھ میں آتی ہے مگر بچوں کی پرائیویسی کتنی خطرناک ہے۔ یہ بات سمجھنا از حد ضروری ہے۔ ہم بچوں کو ان کے کمروں میں دھکیل کر محفوظ سمجھتے ہیں جبکہ وہ کمرے میں بند ہو کر والدین کے سوا دنیا بھر سے جڑے ہوتے ہیں۔

جبکہ میاں بیوی پرائیویسی کے نام پہ ایک دوسرے کے موبائل کو ٹچ بھی نہیں کرتے، مگر پرائیویسی کی اس ڈھال کے سالہا سال کے استعمال کے بعد جب نتائج سامنے آتے ہیں تو خرابی و بربادی کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ جب اللہ پاک نے فرما دیا کہ "میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں"۔

تو اس فرمان کے بعد کیسی اور کون سی پرائیویسی بچتی ہے۔ والدین سب سے پہلے تو بچوں کی تربیت ہی ایسی ٹھوس طریقے سے کریں کہ ادھر ادھر کی مخلوقات انھیں بہکا نہ سکے والدین کو چاہیے کہ وہ رول ماڈل بنیں اور اپنا موبائل بچوں کے لیے فری کریں اور انھیں بھی یہی ترغیب دیں۔ میرا موبائل فری ہے گھر میں سب استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بچے وہی کرتے ہیں جو بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں۔

مجھے ایک چیز سے بہت چڑ ہوتی ہے واٹس ایپ گروپس میں بلا اجازت ایڈ کیے جانے سے، جن میں سیکھنے کی چیز بہت کم اور فضولیات بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک دو بار ایسے ہی ادبی گروپ کے نام پہ مجھے بھی ایڈ کیا گیا جہاں استاد صاحب ادب کے نام پہ پتہ نہیں کیا کیا اول فول بول رہے ہیں اور ہر بات کا اختتام اس چیز پہ ہو رہا ہے کہ تحریر اخبار میں لگوانے کے لیے پیسے دینا کوئی بری بات نہیں، اور انتہائی شرم کا مقام یہ ہے کہ نو آموز اس بات پہ صدقنا و آمنا کہہ رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ نئے لکھاری اپنے معیار پہ توجہ دیں وہ پیسے دے کر تحریر کو اخبار میں لگوانا بہتر سمجھتے ہیں۔ ذاتی بات کروں تو بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر کسی بھی گروپ میں شمولیت

آج تک تاریخ میں جتنی بھی سائنسی ایجادات ہوئیں، سب اپنے ساتھ منفی و مثبت پہلو لے کر آئیں۔ جہاں تک موبائل کا ذکر ہے تو جیسے میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ اس بالشت بھر کی ایجاد نے ہماری اتنی ڈھیر ساری چیزوں کو ہڑپ کر کے جنم لیا ہے تو ان کے نقصانات بھی اسی قدر اپنے اندر سمو لیے ہوئے ہیں۔

پہلے لوگ رشتہ داروں کو جلانے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں رہتے تھے اب یہ کام فوری طور پہ واٹس ایپ سٹیس لگا کر حاصل کیا جاتا ہے۔ پہلے شہروں میں ریڈ زون ٹائپ علاقے ہوتے تھے۔ جن سے غلام عباس جیسے جید لکھاری, آنندی، جیسا شاہکار افسانہ کشید کر لیتے تھے مگر اب یہ کام آن لائن کیا جا رہا ہے نہ کسی شہر کی بلدیہ کو مسلہ نہ اہل محلہ کو۔

پہلے مولوی صاحبان کو پیسہ خرچ کر کے ایک مجمع لگانا پڑتا، پھر جس میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فروعی مسائل کی تشریح کی جاتی، جس میں فوری ردعمل کا احتمام بھی رہتا، اب آرام سے گھر بیٹھے کچھ بھی بولو اور فیسبک یوٹیوب یا کسی بھی میڈیم پر شیئر کرو اور آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھو۔

کبھی ہمارے معاشرتی عزت و آبرو کا مقام ہماری تربیت تعلیم اور رکھ رکھاؤ کرتا تھا۔ کبھی گھر، کچن یا بیڈروم کے کچھ حصوں کو چھپا کر عزت وصول کی جاتی تھی۔ اب سرعام دکھا کر ڈالر بٹورے جاتے ہیں۔ جس کے جتنے زیادہ فالور اتنا زیادہ معتبر اتنے زیادہ ڈالر۔ اب ہماری روایات بھی موبائل، ڈالرز اور ٹک ٹاکرز ترتیب دینے لگ گئے ہیں۔ المختصر، دنیا میں ترقی کے نام پہ نت نئی چیزیں تو ایجاد ہوتی رہیں گی عقل و فکر کا تقاضا یہ ہے کہ غلط میں سے بھی درست برآمد کر کے اپنی اور معاشرے کی صلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔

اس کا فائدہ بہت ہے۔ دنیا سے آگاہی ہوتی ہے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید ڈائریکٹر میڈیا، محتسب اعلیٰ، مصنّف، شاعر

1-فی الحال میرے پاس Tecno-20 Camon ہے تاہم تخصیص کوئی نہیں ہے۔
2-فیس بک۔ یوٹیوب۔ واٹس ایپ
3-آدھ گھنٹہ زیادہ سے زیادہ۔ صرف کمنٹ کرتا ہوں تاکہ تازہ ترین صورت حال (ادبی) سے آگاہ رہوں
4-ٹوئٹر استعمال نہیں کرتا۔
5-تاریخی وڈیوز جن کا تعلق قدیم وجدید تاریخ سے ہو۔ تقریباً ایک گھنٹہ رات کو سوتے وقت یا پھر حالات حاضرہ تشویشناک ہوں جیسے آج کل ہیں تو ایک دو پروگرام دیکھ لیتا ہوں
6-ترازو۔ دیکھو سنو جانو۔ این ٹی وی اور کوئی ایک آدھ مستند اینکر۔
7-وقت ہی نہیں ملتا اور سیاسی خبریں چند گھنٹے میں بدل جاتی ہیں اس لیے دیکھنا چھوڑ دی ہیں۔
8-کبھی کبھار اگر یوٹیوب میں نظر آجائے۔
9-نہ دیکھنے کے برابر۔ سوائے اپنے دفتر کی ویب سائٹ کے وہ بھی تب جب کوئی اردو ترجمہ شامل کرنا ہو۔
10-صرف ڈکشنری کے لیے۔ انگریزی لفظ کے معانی یا اردو لفظ کی انگریزی کے لیے
11-تقریباً 6 گھنٹے تو لگ جاتے ہیں کیونکہ دفتر کا سارا کام بھی اسی پر ہوتا ہے۔ تمام محکموں سے روابط اور لوگوں کی شکایات اور ان کے جوابات۔
12-بالکل نہیں۔
13-چھوٹے بچوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور وہ گیمز زیادہ کھیلتے ہیں بڑے بچوں کو چیک نہیں کر سکتے کہ وہ خود مختار ہیں۔
14-صرف اپنے دفتر کے ایک گروپ کے۔ باقی گروپوں میں صرف وقت ضائع ہوتا ہے۔
15-وقت تو ضرور صرف ہوتا ہے مگر اس کا فائدہ بہت ہوتا ہے۔ نئی معلومات ملتی ہیں۔ دنیا سے آگاہی ہوتی ہے۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے اور میں پوری دنیا سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مثلاً یہی دیکھیں کہ آپ کے سوالات کے فوری جوابات لکھ کر آپ کو واٹس ایپ کر دیے اس سے وقت بھی بچتا ہے اور کام بھی آدمی زیادہ کر لیتا ہے۔

علمی و ادبی۔ فکری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسمارٹ فون کا کردار بہت اہم

ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم، لاہور مصنّف، فلسفے کے اسکالر

سائنسی ایجادات نے ہماری زندگی بدل دی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا ہے ایک زمانہ تھا کہ جب یہ ایجاد نہیں ہوا تھا تو لوگ کیسے رہتے ہوں گے کس طرح ایک دوسرے سے روابط رکھتے ہوں گے معلوم نہیں۔ جیسے جیسے سائنسی ایجادات ہوتی گئیں علم و عرفان کے بھی انداز بدلتے گئے۔ ابھی ماضی قریب کی بات ہے کہ پیغام رسانی کے لیے تار گھر ہوا کرتے تھے۔ دوسری جگہ پیغام بھیجنے کے لیے الفاظ کے حساب سے ادائیگی ہوتی تھی۔ ٹیلی فون کی کال ٹیلی فون ایکسچینج سے ملائی جاتی تھی۔ کارڈ اور لفافہ کے ذریعے خط بھیجا جاتا تھا۔ کبوتر کو بھی پیغام رسانی کے لے ے استعمال کیا جاتا رہا۔
گاؤں شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد گاؤں کا حجام رشتے داروں کی طرف بھیجا جاتا تھا وہ سرخ دھاگہ کی بنی ہوئی ''گانٹھ'' کے ساتھ تاریخ کا بھی اعلان کرتا تھا۔ اگر ڈاک کے ذریعے ملنے والے کارڈ کی نکر کٹی ہوئی ملتی تو وصول پانے والا ان پڑھ ہونے کے باوجود سمجھ جاتا کہ کسی عزیز کے انتقال کی خبر ہے۔
اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے موبائل فون نے زندگی میں بے حد تیزی پیدا کر دی ہے دیکھا دیکھی ہر ایک نے موبائل فون اپنی سہولت کے لیے رکھا ہوا ہے۔ چوکیدار، چھابڑی فروش حتیٰ کہ جمعہ دار کے پاس بھی موبائل فون ہے۔ میں تو فلسفہ کا ریٹائرڈ پروفیسر ہوں میں نے کئی سال قبل جب موبائل فون کمپنی نے ایڈوانس لینا بند کیا تو پہلی اور آخری بار سستا اور بٹن والا عام سا فون سیٹ خریدا تھا۔ میری ضرورت نہیں تھی بلکہ

ایسے ہی دیکھا دیکھی میں بھی اس کارکردگی میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد کئی موبائل فون میرے زیر استعمال رہے لیکن سب کسی نہ کسی عزیز نے تحفہ کے طور پر دیا۔ آخ کل آئی فون 16 جی بی زیر استعمال ہے۔ شروع میں ٹچ سسٹم استعمال کرنا نہیں آتا تھا کہ پہلے بٹن والے سیٹ کی طرح زور سے دبا دیتا تھا لیکن اب کافی کچھ سیکھ لیا ہے۔ دوست احباب کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو السلام علیکم، صبح بخیر اور گڈ مارننگ کے میسج فجر کی نماز کے بعد کرنے کی عادت پڑ گئی ہے کہ یہ بھی ایک دُعا ہی ہے جو اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لیے کی جاتی ہے۔ اسی طرح جواب بھی آتا ہے۔

ٹویٹر کا کوئی استعمال نہیں ہے۔ پھر بھی کسی کی بھیجی ہوئی کوئی دلچسپ وڈیو یا اہم پیغام یوٹیوب پہ دیکھ لیتا ہوں یا بعض اوقات مزاحیہ ادبی علمی وفکری وڈیو کو دلچسپی سے دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھار وہ خبریں موبائل پہ مل جاتی ہیں جو کسی ٹی وی چینل یا اخبار میں نہیں ملتیں۔ بعض اوقات غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کئی ایک پیغامات جعلی فیک یا مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایسے کئی نوٹس بھی تیار ملتے ہیں جو بعد میں جعلی نکلتے ہیں۔ آج کل میٹا کی سہولت بے حد مفید ہے مجھے عموماً کسی مضمون یا تقریر کے لیے مواد کی ضرورت ہو تو میں میٹا سے حاصل کر لیتا ہوں۔

موبائل فون ایک بے حد مفید مطلب اور وقت کی اہم ضروت ایجاد ہے اس کے بغیر زندگی پھیکی سی لگتی ہے۔ مختلف علمی، ادبی وفکری تقریبات میں جانے کے لیے واٹس ایپ سے ہی دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔ عید مبارک اور شادی کا رڈ چھاپنے کی بھی ضرورت نہیں رہی موبائل فون سے ہی پیغام بھیج دیا جاتا ہے۔ بیرون ملک سے ایک زمانہ میں کئی گھنٹوں کی تگ ودو کے بعد فون کال ملتی تھی اب موبائل کے ذریعے عزیزوں سے چند سیکنڈوں میں کال مل جاتی ہے اور بغیر خرچہ کے آدھ پون گھنٹہ واضح آواز میں آڈیو اور وڈیو کال کی جاتی ہے۔ وقت کا فرق جانتے ہوئے انگلینڈ اور کینیڈا امس بیٹیوں سے کافی دیر گفتگو ہو جاتی ہے۔

سائنسی ایجاد سے استفادہ کرنا چاہئے ایک زمانے میں وی سی آر کو دیکھنا برا سمجھا جاتا تھا پھر وہ عام ہوگیا اور لوگوں کی ضرورت بن گیا۔ آج کل یہی صورت حال موبائل فون کی ہے اس لیے چھوٹے معصوم نواسے نواسیاں موبائل پر کوئی نہ کوئی کارٹون فلم یا کھیل کھیل لیتے ہیں۔ بڑے بچوں کی بھی اپنی ذمہ داری ہے وہ اپنے اپنے موبائل فون پہ اپنی ضرورت کے مطابق پیغام رسانی یا وڈیو وغیرہ دیکھتے ہیں۔ ان کو منع نہیں کرتے کیونکہ ان پر اعتبار کرنے سے ان میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اسکول کالج اور یونیورسٹی کے مضامین کا بہتر مواد بھی موبائل فون سے حاصل ہو جاتا ہے۔ بچوں کو ان کی انچارج مس ہوم ورک بھی والدین کے موبائل پر بھیج دیتی ہیں ملکی حالات کا بھی موبائل سے پتہ چلتا ہے کہ انسان ہر وقت ٹی وی تو نہیں دیکھتا یا گھر سے باہر ہو تو خوشی وغمی کا بھی اسی سے معلوم ہوتا ہے اسی لیے میں چند ایک اہم واٹس ایپ گروک کا ممبر ہوں جس سے اراکین کے خیالات اور دیگر خبروں کا پتہ چلتا رہتا ہے اس کے لیے روزانہ کئی گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ موبائل فون اب فیشن نہیں بلکہ ضرورت بن گیا ہے اس لیے متعصبانہ رویہ نہیں اپنانا چاہئے۔

اسمارٹ فون یقیناً علمی وفکری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لے بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے تعلیم یافتہ افراد کے لیے یہ نہایت ضروری ہے پھر ایسی ایسی نایاب تصاویر گیلری میں جمع کی جاسکتی ہیں کہ ویسے شاید وہ دستیاب نہ ہوں۔ ابھی یہ لکھ ہی رہا تھا کہ میری بیٹی عائشہ جاوید جو لندن سے آئی ہے اس نے مجھے سام سنگ کا بہترین جدید موبائل فون 128 جی بی تحفتاً دیا ہے ابھی سوچ رہا ہوں کہ نئی سم حاصل کرلوں یا اسی نمبر کو اس میں ڈال لوں۔ پاکستان میں کروڑوں افراد موبائل فون استعمال کرتے ہیں۔ اس سے آگے مستقبل میں کون سی ایجاد آنے والی ہے ابھی کچھ معلوم نہیں جیسے آج سے پچاس سال قبل اس اسمارٹ فون کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ کسی عزیز کو خط لکھا جاتا تو کئی بار مہینہ بعد جواب ملتا تھا۔ اب ہم اسمارٹ فون کے اتنے زیادہ عادی ہوگئے ہیں کہ چند سیکنڈ بھی اسے استعمال کیے بغیر نہیں رہ سکتے مجھے اسمارٹ فون سے استعمال اور کسی ایپ کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں ہے بیٹی سروش جاوید نے بی ایس کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے وہ اس کی بنیاد پر ایک نجی فرم میں ملازمت کرتی ہے۔ کوئی بھی فون میں مسئلہ پیدا ہو تو میں اس سے مدد حاصل کر لیتا ہوں۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کمپوزنگ جان چکا ہوں اس لیے بہت آسانی سے مختلف پیغامات خود ہی ٹائپ کر لیتا ہوں۔ ٹائپ سے یاد آیا ایک زمانے میں ٹائپ رائٹر ہوتی تھی۔ اس مشین سے ٹائپ کرتے ہوئے غلطی ہو جائے تو مشکل سے ٹھیک ہوتی تھی۔ لیکن اسمارٹ فون میں آپ دوبارہ جانچ پڑتال کر کے غلطیاں لگا سکتے ہیں اور اس میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ ماضی کی مدد سے مستقبل پہ نظر رکھنی چاہئے کیونکہ بقول علامہ اقبال

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

عوام مسائل سے غافل حکومتوں سے مسائل حل کروانے کے لیے سوشل میڈیا موثر آواز

پروفیسر شاداب احمد صدیقی، حیدرآباد مصنف، کالم نگار، دانشور، ماہنامہ 'اطراف' کے حیدرآباد میں بیورو چیف

1. Samsung A32
2. واٹس ایپ، فیس بک، ٹک ٹاک، ریڈیو پاکستان حیدرآباد ایپ، یوٹیوب۔
3. فیس بک کا استعمال وقفے وقفے سے۔ اچھی اور نئی پوسٹ پر لائک کمنٹس کرتا ہوں
4. ٹوئٹر استعمال نہیں کرتا
5. یوٹیوب پر ڈرامہ، فلم دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی گانے سننے کے لیے یوٹیوب کا استعمال کرتا ہوں۔
6. کسی کے نہیں۔
7. جی ہاں، اخبارات کا مطالعہ کرنے کے لیے ای پیپر، تازہ ترین خبریں، ٹک ٹاک پر مختلف نیوز چینلز کو لائک کیا ہوا ہے۔
8. جی ہاں گوگل پر۔
9. روزنامہ جنگ، روزنامہ ایکسپریس روزنامہ جرات، ماہنامہ اطراف کراچی، ریڈیو پاکستان
10. معلوماتی مضامین، مختلف لغات، ڈکشنری
11. وقفے وقفے سے 6 سے گھنٹے
12. نہیں
13. جی ہاں
14. پانچ

15.علم میں اضافہ ہوتا ہے اور معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔تفریحی پروگراموں کے لیے بھی اچھا ذریعہ ہے۔مثبت استعمال سے مثبت نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ہر چیز کا حد سے زیادہ استعمال نقصان دہ ہے اور ضروری استعمال سے بیزاری نہیں ہوتی ہے۔

آج کل سوشل میڈیا کی بدولت دنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔سوشل میڈیا رابطے کا آسان اور سستا ذریعہ ہے،آپ جہاں اور جس جگہ بھی ہوں وہیں سے میلوں دور بیٹھے افراد سے نہ صرف بات کر سکتے بلکہ انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں اور جب چاہیں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔سوشل میڈیا کی بدولت فاصلے سمٹ گئے ہیں اور دوریاں ختم ہوگئی ہیں۔سوشل میڈیا فی الوقت تیز ترین ذریعہ اطلاعات ہے جس کیوجہ سے اس کے اثرات بھی فوری مرتب ہوتے ہیں معاشرہ اس کا اثر قبول کرتا ہے اور اسے بعض اوقات حوالے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

جہاں سوشل میڈیا کے ہوتے ہوئے جھوٹ کو پھیلانا آسان ہے وہیں اب سچ کو چھپائے رکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔

سوشل میڈیا اب ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا ہے اس کو دیس نکالا دینا ممکن نہیں جبکہ اس کے بہت سے مفید پہلو بھی موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے معاشروں کی تشکیل نو اور ذہنوں کی آبیاری کا کام لیا جا سکتا ہے۔وہ افراد،ادارے اور مقامات جہاں عام آدمی کی پہنچ ممکن نہ تھی وہاں اپنی آواز کو پہنچانا،اپنے پیغام کی دسترس میں لانا اور انہیں ردعمل دینے پر مجبور کرنے کا کام سوشل میڈیا سے اب نسبتاً سہل ہو گیا ہے۔خاص طور پر تیسری دنیا کی حکومتیں جو عوامی مسائل سے غافل رہتی ہیں انہیں ان مسائل کے حل پر مجبور کرنے میں سوشل میڈیا مؤثر آواز ہے۔

گوگل پر صرف ایک کلک کی دیر ہوتی ہے اور ساری معلومات سیکنڈوں میں ہمارے سامنے حاضر ہو جاتی ہیں۔ہر طبقہ فکر اور علم کے متلاشی لوگوں کے لئے ہر طرح کی کتابیں،معلومات اور لیکچرز آن لائن مفت موجود ہیں۔آپ چاہے ان کتابوں کو مفت میں آن لائن پڑھیں یا پھر ڈاون لوڈ کر لیں۔اگر کوئی شخص آن لائن نہیں پڑھنا چاہتا تو اس کے لئے اس کی پسند کے اسکالرز اور ٹیچرز کے لیکچرز یوٹیوب چینل پر دستیاب ہیں۔وہ جب چاہے وہاں جا کر دیکھ سکتا ہے۔سوشل میڈیا کے ذریعے نوجوان نسل ای کامرس کے ذریعے گھر بیٹھے کاروبار کر رہے ہیں اس کے علاوہ یوٹیوب،ٹک ٹاک اور دیگر ایپس آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے۔سوشل میڈیا اب زندگی کا اہم اور لازمی حصہ ہے۔

علمی ادبی مباحث معلومات اور بالخصوص پاکستانی ڈراموں کے لیے

ڈاکٹر عنبر عابد۔بھوپال (بھارت) پروفیسر۔مصنّفہ۔شاعرہ

1۔ون پلس 2۔انسٹاگرام،فیس بک،واٹس اپ،فون پے،بینکنگ وغیرہ 3۔ضرورت کے مطابق اور اندازے سے تقریباً تین گھنٹے 4۔ٹیوٹر استعمال نہیں کرتی۔
5۔حالات حاضرہ کی معلومات تبصرے،علمی ادبی ڈسکشن اور معلومات،پاکستانی ڈرامے۔شعر وسخن سے وابستہ وڈیو،کوکنگ وڈیو وغیرہ 6۔ادبی اور شعر وسخن سے وابستہ کوئی بھی چینل۔
7۔حالات حاضرہ پر۔ 8۔جی 9۔ریختہ اور نظامت کے حوالے سے دیگر معلومات کے لیے تلاش۔ 10۔شعر وسخن سے وابستہ۔ 11۔تین گھنٹہ۔
12۔جی 13۔نہیں اب ماشااللہ باشعور اور خود کفیل ہیں۔ 14۔تقریباً آٹھ گروپ ہیں جس میں سے تین ملازمت سے منسلک ہیں۔باقی تین ادبی گروپ اور دو فیملی گروپ ہیں۔
15۔اسمارٹ فون عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے۔انٹرنیٹ نے فاصلے سمیٹے اور ساری دنیا اس چھوٹے سے موبائل میں سما گئی۔آج اس موبائل فون کا استعمال گھر ملازمت بینکنگ،کوکنگ کے لیے کچن میں بھی ہوتا ہے۔اس میں تمام دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔علم وادب کا خزانہ بھی کتابیں پڑھی جا سکتی ہیں۔اور اپنوں سے آن لائن رابطہ گویا معجزہ ہے۔کیا نہیں ہے اس میں لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود اس کا بے جا استعمال نقصان دہ اور وقت کی بربادی کا سبب ہے۔بالخصوص بچوں کے لیے انتہائی خطرناک بلا ہے۔

ملکی اور غیر ملکی اخبارات کے لیے ویب سائٹس کا مشاہدہ

سلیم منصور خالد۔لاہور مصنّف۔محقق۔منصورہ میں بین الاقوامی تعلقات کے ماہر

1۔ایپل گیارہ 2۔واٹس ایپ 3۔ہفتے میں دو بار پندرہ بیس منٹ تک 4۔ٹوئٹر/ایکس نہیں استعمال کرتا 5۔آدھے گھنٹے سے ایک یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ۔
6۔متفرق سیاسی مباحثے 7۔نہیں 8۔بہت کم 9۔پرائیویٹ پروڈکشن 10۔بیرونی اور قومی اخبارات 11۔دو سے ڈھائی گھنٹے تک
12۔نہیں دیتا 13۔کارٹون 14۔13 گروپ 15۔معلومات ادھوری اور مبالغہ کا غلبہ

زیادہ تر تحقیق اور نئی ایجادات کے لیے

محمد شاکر حسین۔ حیدرآباد مصنّف۔صحافی

1-زیادہ تر سائنسی ویب سائٹ استعمال کرتا ہوں
2-واٹس ایپ۔فیس بک۔ایکس۔لنکڈ ان۔یوٹیوب
3-دو گھنٹے۔پندرہ سے بیس Likes۔تبصرے پانچ سے دس
4-سیاسی اطلاعات۔
5-ایک گھنٹہ زیادہ سے زیادہ۔تفریحی وڈیوز۔
6-ممتاز صحافی۔جیسے فہیم صدیقی
7-تحقیقی اور تعلیمی خبریں
8-جی ہاں۔
9-تحقیق اور ایجاد
10-خبریں اور تحقیق
11-چار گھنٹے
12-جی بالکل
13-جی ہاں۔میری بیگم کی ڈیوٹی ہے کہ وہ چیک کرتی رہیں
14-چالیس سے زیادہ گروپوں میں
15-نقصانات بھی ہیں فائدے بھی

زیادہ تر سائنسی ویب سائٹ استعمال کرتی ہوں

عطیہ حسن۔کراچی لیکچرر۔مصنّفہ۔تجزیہ کار

1-زیادہ تر سائنسی ویب سائٹ استعمال کرتی ہوں

2-واٹس ایپ۔آفس سوٹ۔ایم ایس آفس۔اڈوب۔آڈیوز ریکارڈ۔جی میل۔یاہو۔بینکنگ۔کولاج میکر۔فائل ایڈیٹر۔انسٹا گرام۔اسنیپ چیٹ

3-مختلف اوقات میں مگر کل دو گھنٹے

4-ملکی و بین الاقوامی خبریں۔پسندیدہ شخصیتوں کے ٹویٹ۔

5-ایک گھنٹہ مجموعی طور پر۔

6-سونے کے وقت کی کہانیاں۔بچوں کے تعلیمی چینل۔بعض اوقات اچھے ڈرامے

7-وزیر اعظم مریم۔نواز۔۔پی پی پی۔تعلیمی

8۔ناسا فیس بک۔نیشنل جغرافیکل۔سائنس کی دنیا۔جستجو

9۔اردو ادب

10۔اپنے تھیسس کے لیے جو ضروری ہو۔کھانا پکانا۔فیشن

11-4 گھنٹے

12-بیٹے کے ساتھ۔کہانیاں

13-تمام ایپس پر کنٹرول کے لیے پابندیاں

14۔پروفیشنل۔ریجنل۔دوستوں۔فیملی کے گروپس کی رکن

15-اس کے استعمال سے وقت بچتا ہے۔کاغذ ہو یا نہیں وہیں ضروری نکات درج کرتی ہوں۔مجھے بہت مدد ملتی ہے۔اپنی تحقیق میں۔اِدھر اُدھر جانے میں مدد ملتی ہے۔ہر عمل کا ریکارڈ اس میں ہوتا ہے۔ موبائل میں سب کچھ محفوظ کر کے مجھے زیادہ کاغذات نہیں رکھنے پڑتے۔جب بھی مجھے کوئی ضرورت ہو تو اینڈرائڈ فون میری مدد کرتا ہے۔ ❁

ملائیشیا میں رمضان المبارک

”حافظ نعمان ساجد بسلسلہ تدریس ملائشیا میں مقیم ہیں۔ ہماری درخواست پر اہم موضوعات پر بہت رواں اور سادہ اُردو میں تحقیق کے بعد تحریریں ارسال کرتے ہیں۔ رمضان المبارک کے استقبال کے لیے ان سے درخواست کی گئی تو بہت ہی معلومات افزا تحریر ارسال کی ہے۔ ’اطراف‘ کو فخر ہے کہ ہم اپنے قارئین کو عالمی اور آفاقی اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔“

سوراؤ۔کمپونگ (چھوٹی اور دیہی مساجد) میں افطار اور تراویح کا خاص اہتمام

کوالالمپور سے حافظ نعمان ساجد کی انتہائی معلوماتی تحریر

ملائیشیا دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کی طرح ملائیشیا میں بھی رمضان المبارک کا استقبال شایان شان طریقہ سے کیا جاتا ہے بچوں بڑوں حتیٰ کہ خواتین کی خوشی بھی دیدنی ہوتی ہے چھوٹی مساجد جنہیں ”سوراؤ“ کہا جاتا ہے اور جامعہ مساجد میں نماز تراویح کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے نماز تراویح میں مرد وزن بچے بھی مساجد میں ذوق وشوق سے آتے ہیں کمپونگ یعنی دیہی علاقوں کی مساجد ہوں یا جامعہ مساجد دونوں میں روزہ داروں کے لئے افطاری کا انتظام کیا جاتا ہے جامعہ مساجد میں تو باقاعدہ ٹیبل کرسیاں لگا کر افطاری کروائی جاتی ہے۔ ملائیشیا میں اذان کی آواز کے ساتھ ہی روزہ افطار کیا جاتا ہے اسی طرح سحری میں بھی اذان کے ساتھ روزہ رکھا جاتا ہے ملے زبان میں روزہ کھولنے کے عمل کو بربوکا پوآسا کہا جاتا ہے ایک اہم بات ملائیشیا میں مختصر ترین تراویح پڑھائی جاتی ہیں ہر رکعت میں دو یا حد تین آیات تلاوت کر کے رکوع کیا جاتا ہے اور اس پر مستزاد قاری صاحب نے دوران تراویح اپنے سامنے قرآن مجید کھولا ہوتا ہے اور قرآن مجید سے دیکھ کر تراویح پڑھاتے ہیں جامعہ مساجد اور چھوٹی مساجد یعنی سوراؤ میں یکساں تراویح پڑھانے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی عارضی فوڈ سٹریٹ فوڈ کورٹ بازار اور سٹالز وغیرہ سج جاتے ہیں اور گذشتہ چند سال سے ان میں فوڈ ٹرکس کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ونڈرز چھوٹے ٹرکوں میں نصب جدید

تراویح میں کھلے قرآن مجید سے پڑھ کر قرآن ختم کیا جاتا ہے

ترین مشینوں کے ساتھ تیار کردہ کھانا و مشروبات گاہکوں کو پیش کرتے ہیں رمضان بازاروں میں جہاں انواع و اقسام کے کھانے مشروبات ہوتے ہیں وہیں ایسے روایتی ملے کھانے بھی تواتر سے دیکھنے کو ملتے ہیں جو باقی سال خال خال نظر آتے ہیں ان روایتی کھانوں میں لمنگ لیرے سرفہرست ہے لمنگ لیرے دراصل بانس

ملائیشیا میں رمضان المبارک

کے کاٹے ہوئے خول میں ڈالے ہوئے گلوٹین رائس، مچھلی، بیف یا چکن ہوتا ہے ان بانس کے خولوں کو لکڑی یا کوئلوں پر سینکا جاتا ہے انڈونیشیا ملائیشیا برونائی وغیرہ میں لمنگ لیرے کو ایک سوغات کا درجہ حاصل ہے۔ روٹی جان، آپام بالے، مرتبک اور ناسی بوبر بھی رمضان بازاروں کی زینت بنتے ہیں بلکہ ناسی بوبر کو رمضان کے آخری ایام میں یونیورسٹیوں مساجد سڑکوں بازاروں چوک چوراہوں ٹریفک سگنلز وغیرہ پر عوام الناس میں مفت بانٹا جاتا ہے ناسی بوبر کو آپ ایک طرح ملے لوگوں کا کسی قدر حلیم کہہ سکتے ہیں ناسی بوبر جو ٹوٹا چاولوں جھینگوں بیف چکن اور دیگر مقوی اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے جو زود ہضم ہونے کے ساتھ فرحت بخش ہے۔ نماز تراویح میں بھی نمازیوں کے لئے ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے جسے مورے کہا جاتا ہے جوس کافی چائے اور ہلکا پھلکا کھانا رکھا جاتا ہے۔ ملائیشیا میں 17 رمضان المبارک کو نزول قرآن کی تقریب ہوتی ہے 17 رمضان المبارک کو ملائیشیا بھر میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے یعنی عید سے 13 دن قبل نزول قرآن کی تقریب ہوتی ہے یہ ایک طرح سے

17 رمضان المبارک۔ نزول قرآن کی تقریب پورے ملک میں تعطیل

اختتام قرآن کی تقریب کہلاتی ہے ملائیشیا میں رمضان میں جو ایک قباحت روزہ داروں کے لئے سوہان روح بنے ہوئی ہے وہ طویل ترین دفتری اوقات ہیں پاکستان اور دیگر اسلامی خصوصاً عرب اسلامی ممالک میں جس طرح رمضان میں دفتری اوقات میں کافی

حد تک کمی کر دی جاتی ہے ملائیشیا میں اس کا تصور محال ہے ملائیشیا میں رمضان میں بھی وہی دفتری اوقات رہتے ہیں جو بقیہ سارا سال ہوتے ہیں یعنی صبح سویرے کام کاج کے لئے گھر سے نکلو اور شام گئے واپس لوٹو اور پھر شام کو بعض جگہوں پر شدید ٹریفک جام کی وجہ سے بعض روزہ داروں کو سڑک کنارے واقع سٹالز یا ڈھابوں وغیرہ پر ہی روزہ افطار کرنا پڑ جاتا ہے اس کی شاید ایک وجہ ملائیشیا کی معیشت پر در پردہ چینی ملائیشین شہریوں کا کنٹرول ہے بڑے بڑے تھیم پارک تقریباً ساری انڈسٹری تعمیرات اور دیگر بڑے کاروبار چائنیز کے ہاتھ میں ہیں کہنے کو تو بہت کچھ ہے بس ابھی اتنا کافی ہے ہاں چلتے چلتے بتاتا چلوں کہ ملائیشیا میں شب برات پر کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا دیہی علاقوں میں بچے بالے شب برات کی آمد پر پٹاخے پھوڑتے ہیں پٹاخوں کو ملے زبان میں ''مرچن'' کہا جاتا ہے باقی ملائیشیا میں عید الفطر کی آمد اور تاملوں اور چائنیز کے تہواروں پر آتش بازی اور پٹاخے چلائے جاتے

ریاست کیلانٹان میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا کنٹرول

ہیں ملائیشیا کی ایک ریاست کیلانٹان میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا کنٹرول ہے شاید وہاں زیادہ اسلامی احکام پر عملدرآمد کیا جاتا ہے کیونکہ پورے ملائیشیا کے برعکس کیلانٹان میں عید الاضحیٰ کی دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ❁

رمضان میں قیمت نہ بڑھائیں تو کب؟

تحریر: ریحانہ اعجاز۔ کراچی عمار

ریحانہ اعجاز ڈیفنس کراچی 'اطراف' کی قلمی معاونین میں سے ہیں۔ شگفتہ اور شیریں لکھتی ہیں۔
رمضان المبارک کے حوالے سے ایک طنزیہ عنایت کیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

''اتنی مہنگائی، اوپر سے رمضان''

"ایک ہفتہ پہلے جب میں چینی لے کر گیا تھا تو صرف 80 روپے کلو تھی اور آج ایک دم 150 روپے کلو؟ "
اصغر نے تعجب سے سوال کیا۔۔۔
"بھائی ایک ہفتہ پہلے کی بات کرتے ہو، یہاں تو آئے روز دام بڑھتے ہیں، دکان دار لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے دوسرے گاہک کو اس کا مطلوبہ سامان دینے لگا۔
"پھر بھی یار ایک دم سے اتنے دام بڑھانا کوئی جائز تو نہیں"
اصغر ہنوز ششدر، چینی کے دام میں الجھا ہوا تھا۔۔۔
"دیکھ بھائی ہم نے خود سے پیسے نہیں بڑھائے، ہر جگہ یہی ریٹ چل رہا ہے۔" دکان دار نے مصروف انداز میں جواب دیا۔
"لیکن یہ دام بڑھا تا کون ہے؟؟۔ اصغر نے کچھ ناراضگی سے پوچھا۔
"او بھائی دیکھ اپنے پاس اتنا ٹائم نہیں جو تم لوگوں کے سوالوں کا جواب

رمضان آ رہا ہے۔ اس لیے قیمت بڑھائی ہے

دوں۔ لینا ہے تو لو ورنہ اپنا راستہ ناپو۔"
دکان دار نے دوسرے گاہک سے پیسے وصولتے ہوئے کہا۔۔۔
"بھائی لینا تو ہے پر اتنی مہنگائی، اوپر سے رمضان، ہم جیسے لوگ کیا کریں؟۔ اور چینی تو سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے رمضان میں۔" اصغر نے جیسے بے بسی سے کہا۔
"تو ٹھیک ہے نہ رمضان آ رہا ہے اسی لیئے تو قیمت بڑھائی ہے۔ ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ اب اس مہینے بھی نہ کمائیں گے تو کب کمائیں گے۔"
دکان دار کی بے حسی عروج پر تھی۔
اصغر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔۔۔
وہ چاہ کر بھی پوچھ نہ پایا کہ اس بابرکت مہینے میں ثواب کمایا جاتا ہے نہ کہ غریبوں پر رزقِ حلال تنگ کر کے عذاب؟
ذرا نہیں پورا سوچئے۔۔۔ ❁

رمضان المبارک اور امریکی مسلمان

”عاصم متین خان امریکہ میں ماہنامہ ’اطراف‘ کے نمائندہ خصوصی ہیں۔ ہماری درخواست پر ہر مہینے امریکی حالات پر ایک خصوصی تحریر تو بھیجتے ہی ہیں لیکن اہم قومی و اسلامی دنوں میں بھی ہماری گزارش پر امریکہ میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کے مسائل اور اقدامات کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت سادہ زبان مگر رواں دواں۔ اندازِ بیاں معروضی ہے۔ کوشش یہ ہے کہ قارئین ’اطراف‘ کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔“

پورے رمضان میں تراویح میں مسجدیں بھری رہتی ہیں

عاصم متین خان

امریکہ میں ’اطراف‘ کے نمائندہ خصوصی

امریکہ میں مقیم مسلمان اپنے قومی تہواروں کے ساتھ اپنے تمام تر مذہبی تہوار بھی پورے مذہبی جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ رمضان المبارک کی رونقیں امریکہ کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں دیکھنے میں آتی ہیں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کو یہاں بھی انتظار ہوتا ہے کہ چاند نظر آ گیا یا نہیں اس کے لیے وہ اپنی مقامی مساجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ مقامی مساجد سینٹرل ہلال کمیٹی کے اعلان کا انتظار کرتی ہیں یہ کمیٹی امریکہ کی مختلف ریاستوں سے مصدقہ شہادتیں وصول کرتی ہے اس کے بعد یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ چاند نظر آیا یا نہیں۔ اگر مطلع ابر الود ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے امریکہ کی مشرقی ریاستوں میں چاند نظر نہیں آئے تو پھر لوگوں کو

مسلم بچے غیر مسلم بچوں کو رمضان کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہیں

آپس میں افطاری کا اہتمام۔ گروپ کی ہر فیملی ایک دن لوگوں کو افطار پر بلاتی ہے

کیلیفورنیا اور مغربی ریاستوں میں چاند کے نظر آنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے یاد رہے کہ امریکہ کی مشرقی اور مغربی ریاستوں کے درمیان تین گھنٹے کا فرق ہے اس لیے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اگر مشرقی ریاستوں میں چاند نظر نہیں آیا تو شاید مغربی ریاستوں میں نظر آ جائے۔ اگر چاند نظر آ جائے تو فوری طور پر مساجد میں تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے اور پھر پورے رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح میں مساجد بھری رہتی ہیں۔ روزانہ ہر مسجد میں

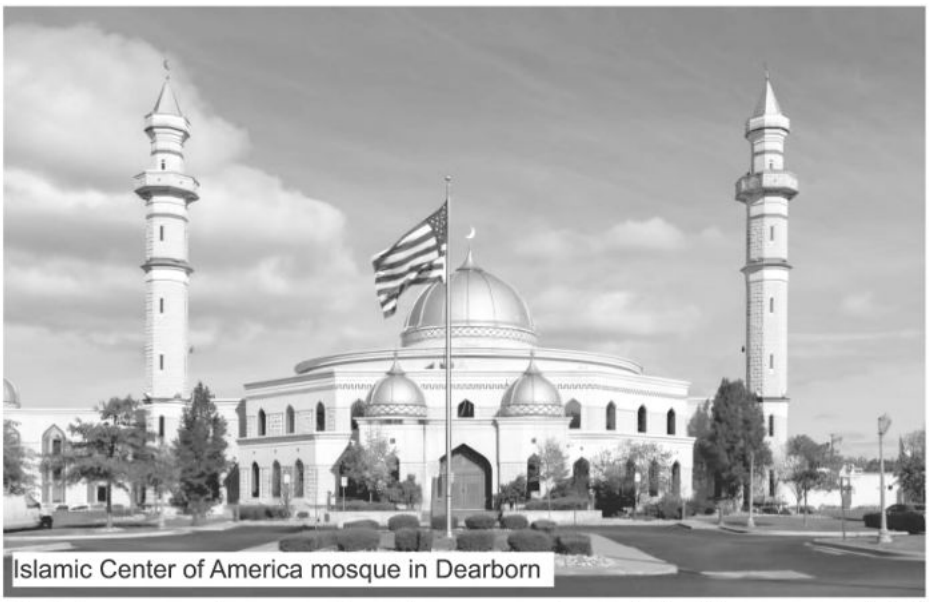

Islamic Center of America mosque in Dearborn

نیویارک میں میئر آفس میں افطار

افطار کا بھی انتظام کیا جاتا ہے عام طور پر مقامی لوگ اپنی مساجد میں لوگوں کے لیے افطار کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسکولوں میں بھی بچوں سے رمضان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلم بچوں کو رمضان کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔ اس کے علاوہ کمیونٹی کے لوگ آپس میں بھی افطار کا انتظام کرتے ہیں اور گروپ کی ہر فیملی ایک دن لوگوں کو افطار پر بلاتی ہے یا پھر ون ڈش پارٹی کر کے بھی افطار کا ایک جگہ انتظام کیا جاتا ہے تاکہ تمام لوگ ایک ہی جگہ پر افطار کر سکیں۔

2024 میں ٹائم اسکوائر میں بڑی افطار پارٹی کی گئی

پچھلے سال نیویارک شہر کے قلب میں ٹائم اسکوائر میں بھی ایک بڑی افطار پارٹی کا انتظام کیا گیا ٹائم اسکوائر پر روزانہ نیویارک کے لاکھوں لوگوں کا گزرنا ہوتا ہے۔ لٹل پاکستان بروکلن میں مساجد سے لاؤڈ سپیکر پر اذان بھی دی جاتی ہے اور تراویح کی تلاوت بھی نشر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے ووٹ بینک کو دیکھ کر مقامی سیاستدانوں نے بھی اپنے دفاتر میں افطار کا انتظام کرنا شروع کر دیا ہے جہاں وہ مقامی مسلمانوں کو بلاتے ہیں اس کے علاوہ میئر کے آفس میں گورنرز کے آفس میں اور وہائٹ ہاؤس تک میں بھی افطار پارٹی کی جانے لگی ہے۔ رمضان المبارک میں مساجد میں ختم القران کی شب پر خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے خصوصی دعائیں کی جاتی ہیں۔ شیرینی اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ کمیونٹی کے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اگر تمام تراویح میں آسکیں یا کم از کم ختم القران کی شب وہ اپنے گھر کی خواتین۔ اور بچوں کے ساتھ ضرور شرکت کر سکیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے مسلمان رمضان المبارک میں بڑھ چڑھ زکوۃ، صدقہ و خیرات بھی کرتے ہیں۔ اکثر مسلمان یہ پیسے اپنے وطن میں مستحق لوگوں کو بھجواتے ہیں۔ غرض یہ کہ رمضان المبارک میں امریکی مسلمان اس ماہ مقدس کو پردیس میں بھی پورے اہتمام سے مناتے ہیں! ❁

ملوا کی اسلامک سینٹر

رمضان میں ہزاروں لوگ ٹائمز اسکوائر پر نماز ادا کر رہے ہیں

صدر ٹرمپ کی میزبانی میں ایک افطار ڈنر

اختر علی مغل آسٹریلیا میں آباد ہیں۔ کتاب سے عشق ہے۔ پاکستان سے نئی کتابیں منگواتے رہتے ہیں۔ ہماری 'رقصِ یعنی' بھی ان کے توسط سے آسٹریلیا پہنچ چکی ہے۔ ہماری درخواست پر اختر صاحب نے آسٹریلیا میں رمضان المبارک میں مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے مختلف معمولات سے آگاہ کیا ہے۔ 'اطراف' کو فخر ہے کہ وہ دنیا بھر میں پھیلے مسلمانوں کے طور طریقوں اور رہن سہن سے آگاہ کر رہا ہے۔

آسٹریلیا میں ترکی۔ لبنان۔ پاکستان۔ افغانستان۔ بھارت۔ بنگلہ دیش۔ انڈونیشیا۔ ملائشیا۔ فجی کے مسلمان زیادہ ہیں

اختر علی مغل۔ آسٹریلیا

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کے آتے ہی شب و روز کے معمولات بدل جاتے ہیں خواہ آپ دُنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں اور دُنیا بھر میں ہر جگہ جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں (مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم) وہاں رمضان المبارک کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

دُنیا میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد گلف، یورپین ممالک، امریکہ،

نیوساتھ ویلز اسٹیٹ میں 120 سے زیادہ چھوٹی بڑی مساجد

آسٹریلیا، جاپان و دیگر ممالک میں ہجرت کرنے والوں کی بھی ہے اور وہ جس بھی ملک میں قیام پذیر ہیں وہیں اپنے پیدائیشی ملک اور ثقافتی وعلاقائی روایت کے مطابق رمضان کا اہتمام کرتے ہیں، گو کہ روزہ و نماز کا حکم تمام مسلمانوں کے لئے یکساں ہے مگر ہر علاقے کا رہن سہن و رسم و رواج اور مقامی موسم روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے اہتمامِ ماہِ صیام بھی مختلف ہے۔

دیگر مملک کی طرح آسٹریلیا میں بھی مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں جن میں زیادہ تر ترکی، لبنانی، پاکستانی، افغانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، انڈونیشین وملائیشین، فجی اور دیگر ممالک کے باشندے شامل

رمضان کی اشیا کے ساتھ عیدالفطر کی تیاریاں بھی

ہیں۔ سڈنی، میلبورن، برزبین، اڈیلیڈ اور پرتھ آسٹریلیا کے آبادی کے لحاظ سے بڑے شہر ہیں اور اس ہر بڑے شہر میں مسلم آباد ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق فقط نیو ساؤتھ ویلز اسٹیٹ (جس کا دارلحکومت سڈنی ہے) میں چھوٹی بڑی 120 سے زائد مساجد ہیں، بڑی مساجد میں لکمبا مسجد، گیلی پولی مسجد اوبرن، رُوٹی ہِل مسجد، مسجدِ عمر، سرے ہِل مسجد قابلِ ذکر ہیں۔

رمضان کی ابتدا کا اعلان۔ رمضان وعیدین کے چاند سے متعلق پاکستان کی طرح مسلمان یہاں بھی دو سے تین گروپس میں تقسیم رہتے ہیں۔

تمام مساجد میں رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی رونق بڑھ جاتی ہے اور تقریباً ہر بڑی مسجد میں افطار و تراویح کا بھی اہتمام ہوتا ہے اور خصوصاً شام کو افطار و تراویح کے وقت پاکستان کی طرح تو نہیں مگر پھر بھی عام دنوں کی نسبت میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔

روزمرہ کی گروسری کی بڑی بڑی مارکیٹ (وولورتھس، کولز وغیرہ) رمضان کریم، رمضان مبارک کے پوسٹر لگا کر کوئی ایک گوشہ رمضان سے متعلقہ اشیاء کا مخصوص کر دیتی ہیں جہاں کھجور، کھجلہ پھینی، روح افزا سمیت دیگر مشروب و اشیاء ارزاں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں۔

تعلیمی اداروں و دفاتر میں زیادہ تبدیلی تو دیکھنے کو تو نہیں ملتی مگر کچھ پرائیویٹ اسلامک اسکول اور اسلامک اداروں کے متعلقہ دفاتر میں رمضان کی وجہ سے اوقات میں نرمی ہو جاتی ہے۔ جبکہ سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں جہاں بھی مسلم ملازمین کام کرتے ہیں وہاں بھی عموماً غیر مسلم عملہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور اکثر جگہوں پر نماز کے لئے کوئی ایک کمرہ یا جگہ مخصوص کر دی جاتی ہے مگر نماز و عبادات کے لئے علیحدہ سے کوئی وقت نہیں دیا جاتا مگر ملازمین اپنا وقت لنچ

مارکیٹوں میں رمضان کریم کے پوسٹر لگا کر کھجور۔ کھجلا پھینی اور روح افزا ارزاں قیمتوں پر دستیاب

بریک کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ (مگر یہ دفاتر کے عملے و افسران پر منحصر ہے)

کمیونٹی میں جگہ جگہ افطار ڈنرز کے اہتمام ہوتے ہیں اس میں سرکاری وغیر سرکاری ادارے بھی شامل ہیں، بلکہ ہر سال نیوساؤتھ ویلز اسٹیٹ

آسٹریلیا میں رمضان المبارک

کا سرکاری سطح ایک پریمئر افطار ڈنر کا بھی اہتمام ہوتا ہے جس میں پوری اسٹیٹ کی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والی تمام اہم شخصیات مدعو ہوتی ہیں۔

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی ہر ویک اینڈ پر کسی بھی مسلم کمیونٹی کی جانب سے رمضان بازار کا خصوصی طور پر اہتمام کیا جاتا ہے جس میں رمضان کی اشیاء کے ساتھ عیدالفطر کی تیاری کا سامان یعنی کپڑے، جیولری، و مہندی کے اسٹال کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے اسٹال سجے ہوتے ہیں خوب گہما گہمی اور ایک میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔

رمضان وعید کی خریداری کے لئے یہاں سڈنی میں یوں تو چھوٹے بڑے بہت سارے شاپنگ فیسٹیول منعقد ہوتے ہیں مگر چاندرات فیسٹیول، رمضان شاپنگ فیسٹیول اور رمضان بازار

لکمبا میں سالانہ رمضان فیسٹیول پورے مہینے

قابل ذکر ہیں جہاں مختلف کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے مسلم و غیر مسلم بلا تفرق حصہ لیتے ہیں اور یوں یہ تقریبات آسٹریلیا میں مقیم مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی کمیونٹی کی کلچرل و مذہبی ہم آہنگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

رمضان کی آمد کے ساتھ ہی مکمل ایک ماہ کے لئے" سالانہ رمضان فیسٹیول" کے نام سے سڈنی کے ایک مسلم اکثریت والے علاقے لکمبا میں مقامی کونسل کی جانب سے اس علاقے کی سب سے بڑی مارکیٹ والے روڈ کو ٹریفک کے لئے بند کر دیا جاتا ہے، تقریبا نصف کلومیٹر سے زائد سجے رمضان کے اس میلے میں ہر طرح کے کھانوں کے اسٹال لگے ہوتے ہیں جو سرِ شام ہی کھل جاتے ہیں اور سحری تک مصروف رہتے ہیں، رمضان المبارک کا یہ" رمضان فیسٹیول"

پورے آسٹریلیا میں شہرت کا حامل ہے جہاں سڈنی و گردونواح کی ہر کمیونٹی کے مسلم و غیر مسلم مختلف طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں۔ مقامی کونسل کی جانب "رمضان فیسٹیول" تک پہنچنے کے لئے کئی علاقوں سے خصوصی طور پر ٹرانسپورٹ (بسوں) کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

افطار سے پہلے ہی لوگ پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں اور افطار کے بعد تو وہاں اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ چلنا محال ہو جاتا ہے۔ عشاء کے وقت لوگوں کی بھیڑ اور گہما گہمی عروج پر ہوتی ہے اور شاہراہ کا بڑا حصہ نماز تراویح کے لئے مختص کر دیا جاتا ہے

ہر طرح کے کھانے، خصوصاً ترکی و لبنانی اسٹاز پر لوگوں کی لائینیں لگی ہوتی ہیں، بہت سے لوگ جن میں غیر مسلم و گورے شامل ہیں۔ اس "رمضان فیسٹیول" کے سب سے مشہور" اونٹ کے گوشت سے بنا "کیمل برگر" کھانے کے لئے لوگ بڑی تعداد میں دور دور سے یہاں پہنچتے ہیں اور یوں رمضان المبارک کا یہ میلہ پورے مہینے اپنی آب وتاب کے ساتھ سڈنی و گردونواح کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کئے رکھتا ہے اور قومی خبروں کی زینت بنا رہتا ہے۔ لکمبا کے اس رمضان فیسٹیول کی شہرت و دھوم کی وجہ سے مسلم اکثریت والے دیگر سبر بز بھی اسی طرح کے ایک روزہ رمضان فیسٹیول کی ابتدا کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ مقامی کونسلز کی جانب سے یہ فیسٹیولز بین المذاہب اور ثقافتی ہم آہنگی و یکجہتی کی علامت کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔

چاندرات کے موقع پر مساجد میں خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ گو کہ عبادات تو تمام مسلمانوں کی ایک ہی ہیں مگر رمضان کی افطار و سحر، تراویح و چاندرات کے اہتمام و اطوار ترکوں، لبنانی، عربوں اور پاک و ہند کے مسلم کے مختلف ہوتے ہیں۔ ❁

80 کی دہائی کے رمضان کا رومان

> کالم نویس۔ مصور۔ درد مند پاکستانی مریم ارشد ایک عرصے کے بعد پھر اپنے مخصوص انداز بیاں۔ ماضی کی یادوں۔ لاہور کے رنگوں سمیت لاہور کی گلیوں میں رمضان کا رومان لے کر آ رہی ہیں۔ ان کے لکھنے کا اپنا ہی اسلوب ہے۔ کالم بھی لکھتی ہیں۔ مطالعہ بہت کرتی ہیں۔ ہماری درخواست پر انہوں نے 1980 کی دہائی کے رمضان پر بہت دل نواز تحریر ارسال کی ہے۔

رمضان کی روحانیت کونے کونے میں محسوس کی جاتی ہے

مریم ارشد، لاہور

یہ ہمارے بچپن کے وہ دن تھے جب فضا اور ماحول میں یک جہتی، محبتیں اور محلے داری ایک بڑے خاندان کی طرح سے بہا کرتی تھی۔ اس دور کی بے شمار سُنہری یادوں میں رمضان کے رُومان کی یادیں چیخ چیخ کر ماضی میں گھسیٹتی ہیں۔ اب بھی چونکہ رمضان کا بابرکت مہینہ آنے ہی والا ہے۔ رجب گزرتے ہی شعبان کے آتے ہی رمضان کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔ آج کے دور کا تو پتہ نہیں کہ لوگ کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ شہر کے جس پوش علاقے میں ہم رہتے ہیں وہاں تو ایسا کوئی رواج نہیں شاید کالونیوں میں یا پرانے لاہور کے محلوں میں پرانے طور طریقے اب بھی رائج ہوں۔ چلیے! میں آپ لوگوں کو ایک بار پھر پرانے رمضان کے رومان کے بارے میں یاد تازہ کرواتی ہوں۔ 1980 میں جب ہم بچے تھے تو اس وقت کے رمضان

ڈھول بجتے۔ سحری کی تیاریاں شروع ہو جاتیں

میں سادگی، روحانیت اور ایک الگ طرز کی سماجی دل کشی کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں نے مل کر لاہور شہر میں اس مقدس مہینے کو سحر انگیز بنایا ہوتا تھا۔ میرا سوہنا شہر لاہور اپنی بھرپور ثقافتی اور تاریخی وراثت اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہے۔ رمضان کے دوران یہ شہر روشنی، بھائی چارے، اُخوت اور عبادات کی ہلکی پُھلکی خوشیوں کے شہر میں بدل جایا کرتا تھا۔ اس دور میں رمضان کی پھیلی ہوئی روحانیت شہر کے کونے کونے میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ سحری کے وقت گلیوں میں گُونجتی مسحور کُن آوازیں، ڈھول بجا کر روزے داروں کو جگانے والے اور بستروں سے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھنے والے بچے ایک عجیب سا ماحول پیدا کرتا تھا۔ سب خاندان والے ایک ساتھ مل بیٹھ کر سحری کیا کرتے تھے۔ باورچی خانے میں ماں، نانی، دادی، بہو، بیٹیاں، سب جمع ہوتیں۔ برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں کسی مدھر گیت کی موسیقی کا سا سماں باندھ دیتیں۔ فجر کی اذان کی آواز سُنتے ہی سب کھانا پینا چھوڑ دیتے مگر میں کھاتی رہتی۔ لاکھ ماں منع کرتی مگر میں اذان کے ختم ہونے تک کھاتی اور ماں کی ڈانٹ کے جواب میں کہتی: پیاری امّی! اللہ نے اتنی سختی نہیں رکھی۔ ان دنوں دن بھر پورے شہر پر ایک خاموشی بھرا سکون چھایا رہتا۔ سہہ پہر سے پھر افطاری کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ کسی گھر میں فروٹ چاٹ بن رہی ہے تو کہیں پکوڑے تلنے کا سامان ترتیب دیا جاتا۔ ماں پالک کے پتے اور بینگن کے گول قتلے خصوصاً بیسن میں بھگو کر گرما گرم تلتیں۔ افطاری کے وقت شام میں اللہ کی برکت، نور اور روحانیت گھلی ہوئی سی ہوتی۔ رمضان کی شامیں ہر شام سے زیادہ حسین ترین ہوتیں۔ مسجدیں بھی روشنیوں سے جگمگا

افطار۔ کہیں فروٹ چاٹ۔ کہیں پکوڑے تلے جاتے

رہی ہوتیں اور صحن تراویح پڑھنے والوں سے بھرے ہوتے۔ خواتین گھروں میں اکھٹے تراویح پڑھا کرتیں گو کہ ان پر فرض نہیں۔ مگر ثواب کا زیادہ سے زیادہ لالچ سبھی کو ہوتا کہ اس مہینے میں نیکی کا ثواب کئی گُنا بڑھ جاتا۔ تراویح پڑھنے کے بعد پھر بازاروں کی رونق بھی دیدنی ہو جاتی۔ بازاروں کی گلیوں میں بلبوں اور سجاوٹ والی لائٹوں کی لڑیاں جگمگا رہی ہوتیں۔ خواتین

اور بچے عید کے کپڑوں، جوتوں اور تحفے تحائف کی خریداریوں میں مصروف ہوتے۔ مہندی اور چوڑیوں کی سٹالوں پر لڑکیوں اور بچیوں کا رش قہقہے بکھیر رہا ہوتا۔ 1980 کی دہائی میں سماجی ثقافت میں سادگی، رنگ، یگانگت اور محبت ایک ایسی لڑی میں پروئی ہوتی جہاں سادگی میں بھی خوشیوں کی جھلک اور محبت کی دمک نظر آتی تھی۔ آج وسائل بہت زیادہ ہیں مگر معاشرے میں عجیب سی بناوٹ سرایت کر چکی ہے۔ اندرون لاہو کی تنگ گلیاں، تاریخی مسجدیں اور تاریخی بازار بھی روحانی محبتوں میں ڈوب کر انوکھے رنگ اور نظارے پیش کرتیں۔ افطاری کے وقت اس دور میں گھروں کے چھوٹے بچے ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائے ہمسایوں میں پکوڑے، دہی بھلے، فروٹ چاٹ، میٹھی مٹھر یاں اور بہت سے لذید پکوان بانٹتے نظر آتے۔ پکوانوں کی یہ طشتریاں خوب صورت کروشیے کے بنے ہوئے ٹرے کورز سے ڈھکی ہوتیں۔ میرے پاس ماں کے ہاتھ کے بنے ہوئے چند ایک گلاسوں اور ٹرالی کے کورز آج بھی موجود ہیں۔ چاند رات

چھتوں پر چڑھ چڑھ کر چاند دیکھنے کا رواج

کے سحر میں تو لڑکیاں اوائل رمضان ہی سے ڈوب جاتیں۔ اس دور میں چھتوں پر چڑھ چڑھ کر چاند دیکھنے کا رواج بھی عجیب طلسماتی منظر ہوا کرتا تھا۔ تب بھی شاید رویت ہلال کمیٹی ہوتی تھی یا نہیں مجھے یاد نہیں پڑ رہا۔ 1980 کی دہائی کے پورے لاہور کا رمضان رومانویت اور روحانیت کا وہ حسین امتزاج ہے جو اب ایک یادگار بن چکا ہے۔ درزی رات دیر تک کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اب تو بہت سے کاروبارِ زندگی کمی کا شکار ہو چکے ہیں۔ آج کے دورِ جدید میں آن۔ لائن ریڈی میڈ کپڑے دستیاب ہیں۔ پنجیج میں آسانی چیزوں کی اہمیت اور ان کی قدر میں کمی کا باعث ہے۔ آج نئے کپڑوں کی ویسی خوشی نہیں رہی جو بچپن میں ہوا کرتی تھی۔ ہماری ماں تو گھر کی سالانہ تفصیلی صفائی رجب کے مہینے سے ہی شروع کر دیا کرتی تھیں۔ جس میں گول کمرے سے لے کر سٹور روم تک ہر جگہ کے کونے کونے کی صفائی ایک لازم امر تھا۔ شعبان سے ہمارے گھر میں قرآن کی دہرائی کا عمل بھی مستحسن عمل تھا۔ اس دور میں لوگ نہایت خاموشی اور راز داری سے مستحقین کی مدد کیا کرتے تھے۔ تراویح کے بعد محلے کے کھیل کے میدانوں میں بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے تھے۔

یوں تو ہر دور کے مختلف چیلنجز ہوا کرتے ہیں۔ مگر 1980 اور شاید اس سے پہلے کے دور میں چیلنجز ہونے کے باوجود محلوں میں گہری ہمدردی، محبت، سخاوت اور فیاضی نظر آتی تھیں۔ سفید پوشی کے باوجود لوگ دوسروں میں بانٹنا پسند کرتے تھے خواہ وہ پکوان ہوں، خوشیاں ہوں یا محبتیں ہوں۔ آج تو نفسانفسی کا دور ہے۔ ہر گھرانہ اگر اپنی ضروریاتِ زندگی کو ہی بخوشی پورا کر لے تو سمجھیں اس نے لاکھوں کمائے۔ لاہور کی تنگ گلیوں میں رہنے والے لاکھوں لوگوں کے دل اور جذبات کشادگی سے بھرے ہوتے تھے۔ آج کے تیز ترین اور مشینی دور میں لوگ محبت کی بجائے خود غرضی کے جذبے میں بھیگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر رمضان کے بابرکت مہینے میں وقت بدل جانے کے باوجود خوشیاں روحانیت کا دامن پکڑے ہر اس بنی نوع انسان کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔ اب یہ دروازہ کھولنے والے پر

زمانہ بدل گیا۔ مگر رمضان کی برکتیں اب بھی دستک دیتی ہیں

منحصر ہے کیونکہ یہ حقیقت تو سبھی جانتے ہیں کہ دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں چاہے دلوں کے ہوں، گھروں کے ہوں یا گلیوں کے! یارمضان کے! ❁

رمضان المبارک میں کراچی میں زکوٰۃ کی ادائیگی

علی بن یونس ایڈیٹر روزنامہ 'بیوپار' ہمارے 'جنگ' میں رفیق کار اور سابق ایڈیٹر یونس ریاض کے صاحبزادے ہیں۔ مرحوم والد کے ورثے کو بہت احتیاط اور اہتمام سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہماری درخواست پر 'استقبال رمضان' پر ایک مختصر سی تحریر سے نواز رہے ہیں۔ چند سطور میں بہت جامع انداز میں کراچی کے معمولات سے آگاہ کر رہے ہیں۔

ہر چار رکعت کے بعد تراویح میں پڑھے گئے قرآن مجید کی آیات کا اُردو مفہوم

تحریر: علی یونس، ایڈیٹر بیوپار کراچی

اللہ کا شکر ہے کہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، اس مہینے کی خوشی کچھ الگ ہی ہوتی ہے، روزے رکھنا، سحری میں اٹھنا، افطاری کرنا اور باقاعدگی سے باجماعت نماز اور تراویح پڑھنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ شہر قائد کراچی میں بھی ہمیشہ کی طرح اس ماہ مقدس کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں، اس مرتبہ لوگ اس لئے بھی خوش ہیں کہ اس بار رمضان نسبتاً سرد موسم میں ہیں اس لئے روزے نسبتاً آسان ہونگے البتہ گھریلو خواتین پر اس ماہ مبارک میں کام کا بوجھ ذرا زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ مختلف کھانے بنا کر پہلے سے فریز

خصوصی اداروں کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا باقاعدہ اہتمام

کر دیتی ہیں تاکہ وہ رمضان کے دنوں میں عبادت کیلئے بھی وقت نکال سکیں۔ سحری میں عام طور پر لوگ کھجلا اور پھینی کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں جبکہ افطاری میں مختلف کھانوں کے علاوہ سموسے، جلیبیاں، پکوڑے، چاٹ اور دہی بڑے بھی بنائے جاتے ہیں اور لوگ ان چیزوں سے بھرپور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک تلخ

سموسے۔ جلیبیاں۔ پکوڑے۔ چاٹ۔ دہی بڑے۔ سحری میں کھجلا اور پھینی

حقیقت یہ بھی ہے کہ اس ماہ اشیائے خورونوش کی قیمتیں کم کرنے کے بجائے بڑھا دی جاتی ہیں تاہم اس ماہ میں ملنے والی رحمتوں اور برکتوں کا وزن چند ناخوشگوار چیزوں کے وزن سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ تراویح کا اہتمام بمعہ ترجمہ وتفسیر ہوتا ہے جس میں بیس رکعات تراویح میں ہر چار رکعات کے بعد امام صاحب ان رکعات میں پڑھا گیا قرآن مجید کا حصہ اردو زبان میں سمجھاتے ہیں۔ یہ کاوش تقریباً بیس سال قبل شروع گئی تھی اب اللہ کے فضل و کرم سے کراچی کے بہت سے مقامات پر اس کا بھرپور اہتمام کیا جاتا ہے اور لوگوں کی بڑی تعداد اس میں شرکت کرتی ہے اور قرآن کو سننے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھنے کی بھی کوشش کرتی ہے جو قرآن کے نزول کا اصل مقصد ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے دوسرے شہروں کی طرح کراچی کے لوگ بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے اسی ماہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ملک بھر میں کام کرنے والے فلاحی اداروں جیسے کہ الخدمت، شوکت خانم میموریل ٹرسٹ، سیلانی، چھیپا، ایدھی، انڈس ہسپتال اور مختلف مساجد و مدارس وغیرہ کو دل کھول کر زکوٰۃ دیتے ہیں جبکہ بہت سے لوگ اپنے گھروں، دفاتر اور دکانوں میں کام کرنے والے غریب ملازمین کی بھی زکوٰۃ کی مد میں مالی مدد کرتے ہیں۔

ضیاالدین اردو کے طالب علم ہیں۔ان سے رابطہ ہماری خودنوشت 'شام بخیر' کی اشاعت کے بعد ہوا۔وہ اس پر تحقیق کررہے ہیں۔ہماری درخواست پر 'اطراف' کے لیے اہم مضامین سے نوازتے ہیں۔ہم نے رمضان المبارک کے استقبال کے لیے لکھنے کی دعوت دی۔اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود انہوں نے باجوڑ میں رمضان کی تیاریوں سے آگاہ کیا ہے۔

باجوڑ میں۔افطار دعوتوں کا خاص اہتمام

باجوڑ سے ضیاالدین کی تحریر

روایتوں اور عقیدتوں کی سرزمین ضلع باجوڑ میں نہایت ذوق وشوق سے رمضان المبارک کا استقبال کیا جاتا ہے۔شب برات کا تہوار رمضان المبارک کی آمد کی نوید سناتا ہے اور لوگ بیتابی سے دن گننے لگتے ہیں۔شب برات پر صدقات وخیرات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے لوگ شبینہ عبادتیں کرتے ہیں اور اس دن روزہ رکھتے ہیں۔

قیام اللیل۔تہجد کا اہتمام بھی ایک معمول

خواتین خانہ رمضان کی آمد سے دو تین دن قبل ہی روزے رکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ضلع باجوڑ کے رہنے والے لوگ روایتوں کے امین ہیں، مذہب کے ساتھ ان کی گہری وابستگی ہے۔معصوم بچے بھی رمضان المبارک کی آمد کی خوشی مناتے ہیں۔سحری کے وقت اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ضد کرتے ہیں کہ ہر روز روزہ رکھیں، لیکن جس دن اچھا سالن پکے، دیسی مرغی یا بکرے کا سالن تیار کیا جائے اس دن بچوں کو بھی سحری کے وقت جگایا جاتا ہے۔یہاں پر افطار میں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔افطار سے قبل بازار کی گہما گہمی عروج پر ہوتی ہے۔ٹھیلوں پر افطاری کے لیے شربت فالودہ اور لوبیا چاٹ، کچالو وغیرہ فروخت ہوتا ہے۔سموسوں، پکوڑوں اور مٹھائی کی دکانوں پر رش ہوتا ہے۔گھروں میں افطاری کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ایک دوسرے کے ہاں افطاری بھجوائی جاتی ہے۔یہاں پر مساجد میں بھی افطاری کرنے کا دستور ہے ہر گھر سے لوگ اپنے ساتھ افطاری لے کر مسجد میں جاتے ہیں اور وہاں پر اجتماعی افطاری ہوتی ہے۔باجوڑ کے لوگ مہمان نوازی میں کوئی ثانی نہیں رکھتے مہمان یہاں پر خاص مقام رکھتا ہے، رمضان المبارک میں لوگ

شب برات سے ہی دن گنے جانے لگتے ہیں

خاص کر افطار دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔دوستوں رشتہ داروں کو افطار کی دعوت دی جاتی ہے۔

مساجد کی رونق تو عام دنوں میں ہی بہت ہوتی ہے لیکن رمضان المبارک میں مساجد کی رونق دیدنی ہوتی ہے۔اکثر نمازوں کے بعد مساجد میں تفسیر قران، درس حدیث کا اہتمام ہوتا ہے دینی مسائل سکھائے جاتے ہیں۔تراویح کا خاص اہتمام ہوتا ہے،ختم قرآن پر

بیرون ملک گئے باجوڑ کے نوجوان رمضان کا مہینہ گھر پر گزارنے کی کوشش کرتے ہیں

باقاعدہ پروگرام منعقد کیا جاتا ہے حفاظ کی دستار بندی ہوتی ہے۔لوگ قیام اللیل کرتے ہیں۔صاحب ہمت لوگ تہجد کی نماز باقاعدہ ادا کرتے ہیں۔نوجوان نسل کامل بیٹھ کر گپ شپ لگانا اور سحری تک جاگنا بھی آج کل معمول بنتا جا رہا ہے۔روزہ جہاں ایک بدنی عبادت ہے وہاں پر روزے کا بنیادی مقصد انسان کے اندر برداشت صبر اور ایثار جیسی اعلی صفات جذبہ پیدا کرنا ہے۔بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرے میں یہ بنیادی انسانی صفات عنقا ہوتی جارہی ہیں ضلع باجوڑ میں بھی رمضان المبارک میں لڑائی جھگڑوں میں اضافہ دیکھنے میں آتا ہے جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں پر نشے کی مذموم لت کے شکار افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی قبیح عادت سے مجبور ہوجاتے ہیں ،نشہ نہ کرنے کے سبب چڑچڑے اور بدمزاج ہوجاتے ہیں اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں ان نشے کے عادی افراد کا علاج اور ان کی اصلاح بھی بے حد ضروری ہے۔

وسائل، مواقع اور روزگار کی کمی کے سبب ضلع باجوڑ کے بیشتر لوگ پردیس میں کام کاج محنت مزدوری، کاروبار کر کے اپنا گزر بسر کرتے ہیں، بہت سے لوگ بیرونی ممالک بلخصوص خلیجی ریاستوں میں کام کرتے ہیں اور وطن عزیز میں قیمتی زرمبادلہ بھجواتے ہیں۔ پردیسی حضرات کوشش کرتے ہیں کہ رمضان رمضان المبارک کا مہینہ گھر پر اہل وعیال کے ساتھ گزارا جائے۔اس لیے یہاں کی رونق میں اضافہ ہو جاتا ہے آخری عشرے میں جہاں بہت سے لوگ اعتکاف میں بیٹھتے ہیں وہاں عید کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں اور خریداریاں زور وشور سے جاری ہو جاتی ہیں۔عید کا خوبصورت دن بہت خوشی سے منایا جاتا ہے۔ ❁

بورے والا میں استقبال رمضان

”رانا محمد شاہد بہت معلوماتی تحریریں قلمبند کرتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف اخبارات و جرائد میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ماہنامہ ’اطراف‘ کے تو یہ خصوصی نمائندے ہیں۔ جب بھی گزارش کی جاتی ہے۔ بہت دلچسپ تحریر عنایت کرتے ہیں۔ رمضان المبارک میں بورے والا میں کیا مناظر ہوتے ہیں اور عید کی تیاریاں کیسے۔ یہ ان سے مارچ کے لیے لکھوائیں گے۔“

رمضان المبارک کا انتظار بہت شدت سے

بورے والا سے رانا محمد شاہد کی خصوصی تحریر

اسلامی سال کے آٹھویں مہینے شعبان کی پندرھویں شب، شب برات کے طور پر منائی جاتی ہے۔ اس مہینے کی برکت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے بعد سب سے زیادہ روزے شعبان میں رکھتے تھے۔

شب برات میں عام طور پر مساجد اور گھروں میں نوافل ادا کیے جاتے ہیں۔ نماز صلوٰۃ تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ درس قرآن اور ذکر و اذکار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

قبرستان میں پیاروں کی قبروں پر پھول

ہم نے اس رات کو بھی ایک رسم بنا دیا ہے۔ شب برات کو اس قدر پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔ جیسے خدانخواستہ ان پٹاخوں سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ بچپن سے ہم دیکھتے آ رہے ہیں، جیسے یہ رات ”پٹاخوں کی رات“ ہو۔ اس رات کے آتے ہی آتش گیر مادے اور بارود وغیرہ سے بنے یہ پٹاخے اور ان کا شور ہر طرف سنائی دیتا ہے۔ خصوصا بچے اور نوجوان عبادت سے زیادہ یہ آتش بازی اور پٹاخے چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہم بچپن میں کبھی کبھار آتش بازی کر لیتے تھے۔ محلے میں حاجی صاحب کی دکان تھی۔ وہاں سے آتش بازی کا تھوڑا سا سامان لایا جاتا اور ابو سے چھپ چھپا کر گھر کے صحن میں یہ شوق پورا کر لیا جاتا۔

پٹاخوں کے بہت زیادہ استعمال سے عبادت میں بھی خلل پڑتا ہے۔ خصوصا بزرگ پریشان بھی ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو بتانا چاہیے کہ یہ رات پٹاخوں کی نہیں بلکہ جہنم کی آگ سے برات (چھٹکارے) کی رات ہے۔ اس رات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اعمال نامے تیار ہوتے ہیں۔ مگر افسوس مسلمانوں کی کثیر تعداد آتش بازی کا سامان خریدتی اور پٹاخے چھوڑ کر اس رات کا مقدس پامال کرتی نظر آتی ہے۔

اس رات بزرگ شب بیداری کے لیے مسجدوں کا رخ کرتے ہیں تو

نوجوان کچھ وقت مسجد میں گزار کر باقی رات محلے کی نکڑوں پہ محافل سجاتے اور گپیں لگاتے ہیں۔ محلے کے اکثر گھروں میں میٹھا بنایا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے بچپن میں حلوہ پوری بنا کر دینے کی روایت تھی۔ امی حلوہ پوری بناتیں اور تین، چار ہمسایوں کے گھر بھجوا دیتیں۔ آج کل حلوہ پوری کے ساتھ دیگر میٹھوں کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے بلکہ اب تو مٹھائیاں جلیبیاں لا کر تقسیم کی جاتی ہیں۔

شب برات کو قبرستان جانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اپنے بزرگوں اور عزیز و اقارب کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھنا بھی ایک روایت ہے۔ یہ رات بڑی عظمتوں اور برکتوں کی رات ہے۔ مگر آج بھی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اسے غفلت اور گناہوں میں گزار دیتی ہے۔ یوں اس کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

کون مسلمان ہوگا، جسے رمضان المبارک کا شدت سے انتظار نہیں ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ رمضان المبارک ہمارے شب و روز تبدیل کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں رمضان کا آغاز چاند دیکھ کر نہیں بلکہ کیلنڈر کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ قمری کیلنڈر کی وجہ سے ہر سال رمضان المبارک دس دن کی تاخیر سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی گزشتہ رمضان المبارک 10 مارچ کو شروع ہوا تھا تو اس دفعہ 28 فروری یا یکم مارچ کو ہونے کا امکان ہے۔ یہ بھی ہے کہ جیسے ماضی میں رمضان المبارک کا چاند اہتمام سے دیکھا جاتا تھا، اب ایسا نہیں۔ یعنی جیسے عید کا چاند دیکھنے کی خوشی اور رغبت ہوتی ہے۔ ویسے نہیں ہوتا۔ بلکہ

رمضان المبارک سے چند دن پہلے کسی مدرسے یا دکان سے کیلنڈر مل جاتا تھا۔اسے برآمدے میں دیوار پر چسپاں یا کہیں ٹانگ دیا جاتا تھا اور آتے جاتے سحری اور افطاری کے اوقات کو دیکھا جاتا تھا۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ سحری کھایا کرو۔اس میں برکت ہوتی

شوگر کے باوجود عام دنوں کی نسبت روزوں میں طبیعت زیادہ بہتر رہتی ہے

ہے۔اس کا تجربہ گزشتہ کچھ سالوں میں بھی ہوا۔سحری میں وہی پراٹھا، سالن، دہی استعمال کرتا تھا۔مگر سحری کے کھانے کی لذت کسی اور وقت میں نہیں ملی۔گزشتہ آٹھ سالوں سے شوگر ہے۔ہر رمضان المبارک میں مختلف رسائل میں مضامین/ فیچرز نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔جن میں بتایا جاتا ہے کہ ذیابیطس کے مریض اپنے ڈاکٹر سے مشورے کے بعد روزہ رکھیں۔الحمدللہ روزے رکھے اور کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کیا۔شوگر میں عام دنوں کی نسبت روزوں میں طبیعت زیادہ بہتر رہتی ہے۔یعنی بھوکا پیاسا رہنے کے بعد افطاری کے وقت شربت/شکنجبین کے چند گلاس یا تھوڑا بہت میٹھا بھی طبیعت بہتر رکھتا ہے۔

کبھی ڈھول بجا کر سحری کے لیے جگانا عام روایت تھی۔اب جدید سہولتیں ہیں۔موبائل پہ مسلسل ٹیون کے ساتھ الارم لگا لیا جائے تو وہ آپ کو جگا کر چھوڑے گا۔ویسے چار، پانچ روزوں کے بعد خود بخود سحری میں جاگ آ جاتی ہے۔اس لیے کہ اٹھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ڈھول اب بھی بجایا جاتا ہے۔مگر اب ڈھول والا آخری عشرے یا اس سے کچھ دن پہلے آنا شروع کرتا ہے۔شاید وہ بھی دیگر پاکستانیوں کی طرح آدھا یا ادھورا کام کر کے پیسے کھرے کرنا چاہتا ہے۔

ایک ادبی تنظیم ''حریم ادب'' کے ممبران زوہیب یاسر اور حافظ محمد

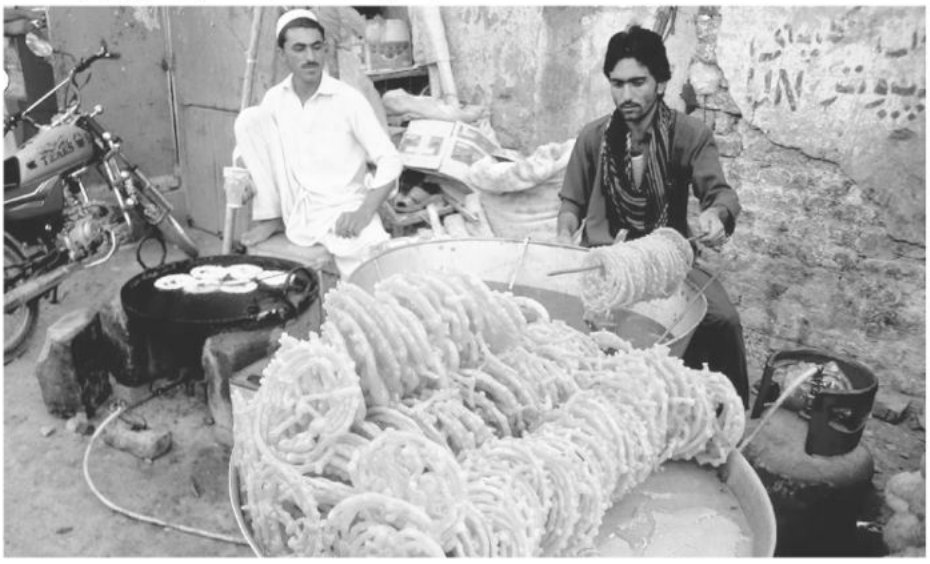

شہزاد نے اس حوالے سے اپنی یادیں بھی شیئر کیں۔

زوہیب نے شب برات میں عبادت کے حوالے سے ایک دلچسپ بات بھی بتائی۔ایسا ہمارے ساتھ بھی اکثر ہو جاتا تھا۔زوہیب نے بتایا۔

''جہاں تک یادگیری کا تعلق ہے تو دسویں جماعت میں ایک بار اخبار سے ایک غیر مصدقہ آرٹیکل پڑھ کر سو نوافل کی نیت کر لی تھی۔ شدید سردی تھی، کوئی ستر، اسیویں نفل پر جا کر کمر جھک گئی۔ اوکھے سوکھے سو پورے کر لیے اور پھر توبہ کر لی کہ آئندہ اخباری خبر پر یقین کر کے نماز نہیں پڑھنی''۔

حافظ محمد شہزاد نے بتایا۔

''رمضان المبارک کی آمد پر نئے کپڑے بھی سلوائے جاتے تھے۔اس نیت کے ساتھ کہ جو نیا کپڑا رمضان میں پہن لیا، اس کا حساب نہیں ہوگا۔اس کے ساتھ گانے، ڈرامے، فلمیں بند کرنے کا بھی اعلان اور اہتمام کیا جاتا۔رمضان کی آمد کے ساتھ ایک خوشی یہ بھی ہوتی کہ افطاری کے وقت خوب ضیافتیں ہوں گی اور ایسے کھانے بھی کھانے کو ملیں گے، جو سارا سال ہمارے جیسے متوسط

سحری کے وقت بعض محلوں میں ڈھول اب بھی بجایا جاتا ہے

گھرانوں کو میسر نہ ہوتے تھے۔روزہ رکھنے پر چھوٹے بچوں کو انعام واکرام سے نوازہ جاتا''۔حافظ صاحب نے مزید بتایا کہ ''رمضان کے پہلے عشرے میں ماحول خوب نورانی، وجدانی رہتا۔مساجد بھری نظر آتیں۔دوسرے عشرے میں گرمیوں کے دن ہوتے تو روزہ رکھ کر گیلے کپڑے سروں پر ڈال کر ایک آدھ فلم دیکھنے کی بھی اجازت ہوتی۔آخری عشرے کے پہلے سات دن روزے بھی تعطل کا شکار ہو جاتے۔یعنی جیسے جیسے عید قریب آتی، عبادتیں اور روزے اختصار پکڑتے جاتے۔پھر ستائیسویں شب کو چراغ رمضان کی لو ایک بار پھر بھڑک اٹھتی اور رات بھر عبادات جاری رہتیں۔اگلے دن عید کا بے تابی سے انتظار شروع ہو جاتا اور عبادات بھی رخصتی پہ چلی جاتیں''۔

رمضان المبارک روزہ رکھنے کے ساتھ تزکیہ نفس کی بھی تلقین کرتا ہے۔یہ برداشت تحمل، درگزر اور قربانی کا درس دیتا ہے۔اس مہینے کی خاص بات اپنے سے کمزور خاندانوں کی مدد کرنا ہے۔تاکہ نہ صرف ان کا رمضان اچھا گزرے بلکہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے عید کی خوشیاں بھی خرید سکیں۔اسی لیے اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ صدقات وخیرات سے غریبوں کی مدد کی جاتی ہے۔ ❁

”اطراف“ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ہم ہر ماہ مہینے کے حوالے سے اپنے قلمی معاونین سے درخواست کر کے ان کے شہر میں ہونے والی سرگرمیوں کی رپورٹ منگواتے ہیں جس سے پورے پاکستان کی ایک معلوماتی تصویر محفوظ ہو جاتی ہے۔ صدام ساگر کالم نویس۔ شاعر بھی۔ ”اطراف“ کے کرم فرما ہیں۔ ان کی تحریر ملاحظہ کیجئے اور اپنی رائے دیجئے۔

ظہر کی اذان ہوتے ہی جگہ جگہ پھلوں کی ریڑھیاں

تحریر: صدام ساگر

اسلامی مہینوں میں رجب کا مہینہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے اس ماہ میں شبِ معراج بہت ہی عقیدت و احترام کے ساتھ سننے، عبادت کرنے اور نیکیاں سمیٹنے کی رات ہوتی ہے۔ اس مبارک دن کو امام الانبیا، رحمتِ دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں کا سفر کرتے ہوئے اپنے خالق کی بارگاہ میں پیش ہوئے۔ یہی وہ مبارک شب ہے جس میں اُمتِ مسلمہ کو پانچ نمازوں کا تحفہ عطا ہُوا جو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ ادا کرتے ہیں، دنیا بھر کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے تمام شہروں کی مساجدوں میں اس بابرکت رات کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، گوجرانوالہ میں بھی دیگر مساجد میں رات گئے تک نوافل ادا کرنے، دُعائیں مانگنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کیوں کہ شبِ معراج کی برکتیں اور رحمتیں سمیٹنے کا بہترین طریقہ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

نبیؐ دیدار کرنے کو خداوند تعالیٰ کا
سوئے افلاک جاتے ہیں شبِ معراج آئی ہے

اسی طرح شعبان کی پندرھویں شب ”شبِ برات“ کہلاتی ہے۔ یعنی وہ رات جس میں مخلوق کو گناہوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔ شبِ برات کی آمد سے دس دن قبل گوجرانوالہ کی مساجد کو روشنیوں سے سجا دیا جاتا ہے، نعت کی خصوصی محفلوں کے لیے اشتہارات کی پرنٹنگ کا کام عروج پر پہنچ جاتا ہے، تبرکات کے لیے بازاروں میں جلیبیاں اور مٹھائیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں، پھر عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد مساجد سے ذکر و اذکار کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف جہاں مساجد میں اللہ کا ذکر ہو رہا ہوتا ہے وہیں دوسری طرف اس بابرکت رات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی پھل جھڑیاں، پٹاخے، موم بتیاں، انار چلانے میں مگن ہوتے ہیں جس سے مساجد میں موجودہ لوگوں کی عبادت میں خاصہ خلل پڑتا ہے۔ خدارا دین اسلام اور اسلامی مہینوں میں ملنے والی بابرکت راتوں کا احترام کریں اور دنیاوی عیش و عشرت کو چھوڑ کر دین اسلام کی قدر و اہمیت کو سمجھتے ہوئے صراط مستقیم پر چلنے کی عادت اپنائیں۔ شبِ برات کے حوالے سے گوجرانوالہ کے نامور نعت گو شاعر امجد حمید محسن کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

نعت کی خصوصی محفلیں۔ اشتہارات کی پرنٹنگ عروج پر

نوازشوں کا در کھلا شبِ برات آ گئی
بھرے گا جھولی ہر گدا شبِ برات آ گئی
تو صدقہ مصطفیؐ کا آج کبریا سے مانگ لے
نہ خالی جائے گی صدا شبِ برات آ گئی

اسی کلام کا مقطع دیکھیے:

گداؤں میں ہے خدا یہ محسنؔ حقیر بھی
عطا ہو صدقہ آلؓ کا شبِ برات آ گئی

شبِ برات کے بعد رمضان کا مہینہ آتا ہے اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ مختلف انداز سے رحمتوں کی برسات کرتا ہے کبھی سحر کے ثواب کے اعتبار سے، تو کبھی افطار کی فضلیت کے نام پر، کبھی روزوں کے انعام کی شکل میں، تو کبھی تراویح کے اجر کے طور پر، کبھی فرائض کا ثواب ستر گنا بڑھا کر، تو کبھی نوافل کو فرائض کی حیثیت عطا کر کے، کبھی سحر و افطار کے وقت دعا کی قبولیت کا مژدہ سنا کر، تو کبھی ہزاروں کی تعداد میں جہنم سے رہائی کا پروانہ تھما کر، اللہ تعالیٰ کے یہاں رمضان کا کتنا بڑا مقام و مرتبہ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگانا مشکل نہ ہوگا کہ اس

نے اپنے کلام کے نزول کے لیے اسی ماہ کا انتخاب کیا، اس مہینہ کے انتظار میں ایک سال قبل سے ہی جنت کو آنے والے رمضان کے استقبال میں سجانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کے آتے ہی پاکستان کے تمام شہروں کی طرح گوجرانوالہ میں بھی اس کی خوب سے خوب تیاریاں کی جاتی ہے۔ پہلے روزے سے لیکر آخری روزے تک گلی محلوں میں ڈھول کی آواز گونجنے سے ہر سحر کو وقت پر روزے رکھنے کے لیے اُٹھنے پر کبھی گھر سے سحری تو کبھی بازار کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں کبھی گھر سے دیسی گھی کی روٹیاں تو کبھی گوجرانوالہ کے مشہور غنی کے پائے، امرتسری اریسہ، صوفی کے کھوئے والے چنے، یادگار والوں کے روغنی نان، گوندالہ والا کے قریب نرالا ہوٹل سے آلو کے پراٹھے اور ساگ کھانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ پھر فجر کی نماز کے لیے مساجد میں جانا اور علمائے کرام کا مختصر سا تیس دن مسلسل صبح کے وقت درس سننا اپنے ایمان کو تازگی دینے اور نیکیوں سے دامن بھرنے سے کم نہیں۔

گوجرانوالہ کے بازاروں میں خریداروں کی بھیڑ

ظہر کی اذان ہوتے ہی گوجرانوالہ کے تمام بازاروں میں جگہ جگہ فروٹ کی ریڑیاں لگانے اور گرما گرم سموسے بنانے کا کام تیزی سے شروع کر دیا جاتا ہے، ظہر کی نماز پڑھتے ہی کچھ لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں مگن تو کچھ لوگ کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عصر کی اذان ہوتے ہی گوجرانوالہ کی چھوٹی بڑی تمام مارکیٹیں اور بازار بند ہونے لگتے ہیں۔ ایسے میں لوگوں کی افراتفری اور جلد بازی دیکھنے پر افسوس ہوتا ہے کہ جہاں دن بھر اتنا صبر کیا ہے وہاں چند لمحوں کے لیے آرام کے ساتھ کسی کو اذیت دیئے بغیر ہم افطاری کا سامان خریدیں اور احتیاط سے دوسروں کو راستہ دیں تاکہ وہ وقت پر اپنی فیملی کے ساتھ روزہ افطار کر سکیں۔ افطار میں گوجرانوالہ میں سول لائن میں قادری سموسہ، گھنٹہ گھر، ریل بازار، نرالا سویٹس، نکا چوک سیالکوٹ سویٹس اور سلمان سویٹس کے چکن سموسہ اور چکوریاں کھانے کا اپنا ہی لطف ہے۔ رمضان کے مہینے میں فروٹ سمیت کھانے پینے کی تمام اشیا کا ریٹ آسمانوں سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جبکہ رمضان بازار میں مرد، بچے اور خواتین دھکے کھا رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گوجرانوالہ میں بہت سے صاحبِ حیثیت لوگ جب زکوٰۃ غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں تو اُن میں چند ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو زکوٰۃ کم نمائش زیادہ کرتے ہیں، میرے کہنے کا مطلب ہے کہ دن بھر خواتین کے چکر پہ چکر لگوانا، دن بھر

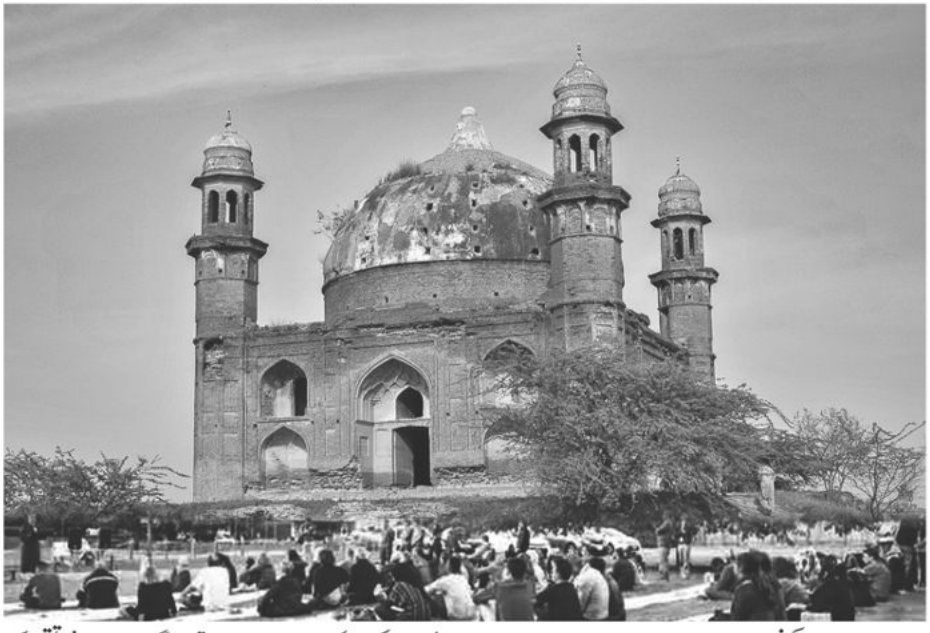

لائن میں کھڑا رکھنا اور پھر بعد میں تین لوگوں میں راشن تقسیم کر کے تصویریں بنوانا پھر اگلے دن کی چھوٹی اُمید دلانا، دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنا یہ زکوٰۃ نہیں بلکہ غریب کی تذلیل کرنا ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھے اور ماہِ رمضان میں اپنے قریبی عزیز و اقارب اور دیگر لوگوں کا خیال رکھے اور انہیں اپنی خوشیوں میں شامل کر کے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کریں۔ کیوں کہ یتیموں، مسکینوں کا خیال رکھنا، روزے داروں کے لیے سحری اور افطاری کا اہتمام کرنا بھی ثواب ہے۔

رمضان المبارک میں بہت سے لوگ روزہ رکھنے کے ساتھ ساتھ عید کی تیاروں کے لیے بازاروں کا رُخ کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ میں گھنٹہ گھر، گڑ جاکھی دروازہ، سیالکوٹی دروازہ، نیائی چوک یعنی گوجرانوالہ کے مین بازار میں چاروں سمت سے آنے والے رستوں میں خریداروں کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ جس میں مرد، خواتین اور بچے عید کی تیاریاں جوش و خروش کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح گوجرانوالہ کی سٹیلائٹ ٹاؤن مارکیٹ میں رات گئے تک شاپنگ سنٹر کھلے رہتے ہیں۔ جہاں بازار سے لوگ مہنگی خریداری کرتے ہیں، گوجرانوالہ مال، راہوالی کے برانڈز کا تو کوئی جوڑ نہیں، اسی طرح گوجرانوالہ کی لنڈا مارکیٹ جہاں کم آمدنی والی لوگ بھی خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ عید ہی ایسا ایک اسلامی تہوار ہے جس میں سب ایک دوسرے سے خوشیاں بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عید کا انمول تحفہ ہمیں رمضان کے تمام روزے رکھنے کے بعد ماہِ شوال کی پہلی تاریخ کو عطا ہوتا ہے۔ آخر میں ماہنامہ ''اطراف'' کے تمام قارئین کو عید کی ڈھیروں خوشیوں کی مبارک باد دیتے ہوئے اپنی ایک نظم ''عید ہے پیارے'' پیش کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا۔

گلے شکوے مٹا کر مسکرانا عید ہے پیارے
پُرانی رنجشوں کو بھول جانا عید ہے پیارے
دلوں سے بغض اور نفرت مٹانا عید ہے پیارے
محبت کی حسیں وادی سجانا عید ہے پیارے
محبت بانٹنے سے کم کبھی ہوتی نہیں یارا
محبت کے دیئے ہر سو جلانا عید ہے پیارے
کسی کے واسطے نفرت نہ رکھ تو اپنے سینے میں
جو روٹھے ہیں اُنہیں جا کر منانا عید ہے پیارے
وہ جن کو بے سبب ٹھکرا دیا سارے زمانے نے
گلے اُن بے سہاروں کو لگانا عید ہے پیارے
چلو وعدہ کریں ہم زندگی بھر ساتھ رہنے کا
یہی پھر عمر بھر وعدہ نبھانا عید ہے پیارے
مری تحریر کو تو نے نیا عنوان بخشا ہے
محبت سے جریدے میں لگانا عید ہے پیارے

❀❀❀

میلسی پنجاب کا ایک اہم شہر ہے۔ یہاں طارق جمال صاحبِ مطالعہ ہیں۔ ہماری ادبی اور صحافتی جہات پر ایم فل کے لیے مقالہ لکھ چکے ہیں۔ ہماری درخواست پر 'اطراف' کے لیے خصوصی مضامین تحریر کرتے ہیں۔ آمد رمضان اور شب برات کے بارے میں بہت دلچسپ مضمون قلمبند کیا ہے۔ کہ ساری مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

میلسی میں شب برأت پر روشنیاں اور روحانی ماحول

میلسی سے طارق جمال کی عقیدت بھری تحریر

اس دور میں ہر ثقافتی اور اسلامی تہوار یا کسی بھی اہم دن میں ایک چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ ان مواقع پر عمارتوں کو برقی قمقموں اور روشنیوں سے سجایا جاتا ہے، جو خوشی اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ شب برات بھی ایسی ہی ایک اہم اور بابرکت رات ہے، جسے مسلمانوں کے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ رات برکتوں اور رحمتوں کے حصول کا موقع فراہم کرتی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ سے

فلاحی تنظیمیں رمضان کی آمد پر ضرورت مندوں میں راشن کے پیکٹ تقسیم کرتی ہیں

گناہوں کی معافی مانگی جاتی ہے۔ فرزندان اسلام اس رات کو مکمل طور پر عبادات اور ریاضت میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اپنے رب کا قرب حاصل کرنے کے لیے شب بیداری کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ نماز مغرب سے شروع ہو کر نماز فجر تک جاری رہتا ہے۔ گو کہ مسلمان ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں، مگر شب برات جیسے خاص مواقع پر عبادات میں غیر معمولی اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مقدس رات میں نوافل، ذکر و اذکار، اور محافل نعت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، جہاں مسلمان نہ صرف اپنی مغفرت کی دعا کرتے ہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل رکھتے ہیں۔

شب برات اور رمضان المبارک جیسے مقدس مواقع نہ صرف مذہبی لحاظ سے اہم ہیں بلکہ ان کا ہماری معاشرتی اور ثقافتی زندگی پر بھی گہرا اثر ہے۔ میلسی جیسے قدیمی اور روایتی شہر میں ان مواقع کو خاص عقیدت اور محبت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی مذہبی ہم آہنگی، تاریخی پس منظر اور خاص تہذیب کے لیے مشہور ہے، جہاں ننانوے فیصد آبادی مسلمان ہے اور مذہبی اجتماعات میں خاص جوش و خروش دکھائی دیتا ہے۔

شب برأت: میلسی کی روایتوں میں رچی بسی مغفرت کی رات

شب برات یعنی پندرہ شعبان کی رات، اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے معمور رات ہے۔ میلسی کے باسی اس رات کو خاص اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ مساجد اور گھروں کو برقی قمقموں اور چراغوں سے سجایا جاتا ہے۔ شہر کی گلیوں اور محلوں میں ایک روحانی ماحول قائم ہو جاتا ہے، جو

لوگوں کے دلوں میں اللہ کی قربت کی جستجو کو مزید بڑھا دیتا ہے۔

اس رات مغرب کی نماز کے بعد سے لے کر فجر تک مساجد میں خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ محافلِ ذکر و نعت منعقد کی جاتی ہیں، اور نوافل ادا کیے جاتے ہیں۔ تبلیغی مرکز اور مرکز فیضانِ مدینہ جیسے دینی مراکز میں اجتماعی عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے جہاں مرد حضرات اللہ کے حضور جھکتے ہیں، جبکہ خواتین کے لیے بھی گھروں یا مخصوص مراکز میں اجتماعی دعاؤں اور ذکر کی محافل منعقد کی جاتی ہیں۔

شب برات کی ایک خاص روایت قبرستان جانا ہے۔ میلسی میں لوگ

سحری کے لیے اب بھی کئی محلّوں میں ڈھول اور گھی کے کنستر بجا کر جگایا جاتا ہے

اپنے مرحومین کی قبروں پر جا کر ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور ان کی مغفرت کے لیے خیرات و نذرانے دیتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف سنت رسول ﷺ کی پیروی ہے بلکہ ایک خوبصورت معاشرتی ہم آہنگی کی علامت بھی ہے۔ میلسی شہر میں دو بڑے قبرستان ہیں: مرکزی قبرستان صوفی بزرگ حضرت بابا نتھے شاہؒ کے مزار سے ملحقہ ہے اور دوسرا قبرستان حضرت پیر غازیؒ کے مزار سے ملحق ہے۔

شب برات کے موقع پر میلسی کے گھروں میں مخصوص پکوان تیار کیے جاتے ہیں۔ کھیر، چاول، اور مختلف اقسام کے حلوے اس رات کی اہم سوغات ہیں، جنہیں اہل خانہ اور غربا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس رات کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ کھانے پینے کی یہ تیاریاں رمضان المبارک کی جسمانی طاقت اور تیاری کے لیے بھی معاون ہوتی ہیں۔

چراغاں اور خیرات: میلسی کی شب برات کا حسن

میلسی کی شب برات کا ایک منفرد پہلو اس رات کی خوبصورتی ہے جو

چراغاں اور دیوں کے ذریعے نمایاں ہوتی ہے۔ بجلی کی موجودگی کے باوجود کئی گھروں اور مساجد میں دیے اور موم بتیاں جلانے کی روایت اب بھی برقرار ہے، جو ماضی کی خوبصورت یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔ مساجد اور محلے کے لوگ اس رات اجتماعی طور پر چراغاں کا اہتمام کرتے ہیں، جو ایک خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔ حضرت بابا نتھے شاہؒ کے مزار پر بھی خصوصی طور پر چراغاں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

خیرات اور نذرانے اس رات کی خاص روایت ہیں۔ لوگ کھانے پینے کی اشیاء جیسے کھیر، حلوہ، چاول، اور دیگر سوغات اپنے مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے بانٹتے ہیں۔ میلسی کے کئی مخیر حضرات اس رات غربا و مساکین کے لیے خصوصی انتظامات کرتے ہیں تاکہ ہر شخص اللہ کی رحمتوں سے مستفید ہو سکے۔

استقبالِ رمضان: میلسی کا روحانی جوش

شب برات کے بعد میلسی میں رمضان المبارک کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ مساجد کو غسل دیا جاتا ہے اور ان کی صفائی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ روایات نہ صرف مذہبی عقیدت کی علامت ہیں بلکہ شہر کی اجتماعی ہم آہنگی کا بھی ایک خوبصورت اظہار ہیں۔

رمضان کی آمد سے قبل گھروں میں صفائی ستھرائی کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے، اور گھروں کے لیے راشن جمع کیا جاتا ہے۔ میلسی کے

بازاروں میں اس وقت خاص گہما گہمی ہوتی ہے، جہاں کھجوریں، فینیاں، اور دیگر سحر و افطار کی اشیاء کی فروخت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ مرکزی بازار قائداعظم روڈ اور شکوری بیکری پر خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ مخیر حضرات اور تنظیمیں ضرورت مندوں کے لیے راشن کے پیکٹ تقسیم کرتی ہیں تاکہ ہر شخص رمضان کے روزے رکھ سکے۔ فلاحی تنظیموں میں اماں سیدن بابا فاضل ویلفیئر سوسائٹی، الخدمت فاؤنڈیشن، ینگ مین سوسائٹی، صراط مستقیم ویلفیئر فاؤنڈیشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مساجد میں تراویح کی تیاری کے لیے حفاظ کرام پورے سال اپنی منزل کی تیاری کرتے ہیں، لیکن شعبان کے آخری دنوں میں یہ تیاری مزید تیز ہو جاتی ہے۔ میلسی میں کئی مساجد میں تراویح کی اجتماعی محافل منعقد ہوتی ہیں، جہاں قرآن پاک کو ختم کرنے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

میلسی کے رمضان کی جھلک

رمضان کے دوران میلسی میں ایک روحانی ماحول قائم ہو جاتا ہے۔

تراویح کے لیے حفاظ کرام پورا سال منزل کی تیاری کرتے ہیں

سحری کے وقت جگانے کے روایتی طریقے جیسے ڈھول بجانا اور گھی کے ڈبے پیٹنا اب بھی کئی محلوں میں رائج ہیں۔ دورِ جدید میں سپیکر اور سائرن کا استعمال بھی عام ہو چکا ہے۔

رمضان کے پہلے دن سے ہی میلسی کے بازاروں میں عید کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ خواتین اور بچے عید کے لیے خریداری کرتے ہیں، جبکہ مرد حضرات گھروں کے لیے راشن اور دیگر ضروری اشیاء کا بندوبست کرتے ہیں۔

غیر ضروری سرگرمیوں سے اجتناب

شب برات اور رمضان جیسے مقدس مواقع پر غیر ضروری سرگرمیاں، جیسے آتش بازی اور پٹاخے بجانا، ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ یہ نہ صرف عبادات میں خلل ڈالتی ہیں بلکہ اللہ کی ناراضی کا سبب بھی بنتی ہیں۔ میلسی کے باشعور لوگ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان مبارک راتوں اور مہینے کی روحانیت کو برقرار رکھا جائے۔

اختتامیہ

شب برات اور رمضان المبارک جیسے مواقع ہمیں اپنی زندگیوں میں روحانی بہتری اور معاشرتی ہم آہنگی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ میلسی جیسے شہر میں یہ مواقع مذہبی عقیدت اور محبت کے ساتھ منائے جاتے ہیں، جہاں لوگ نہ صرف اپنی عبادات کو بڑھاتے ہیں بلکہ اجتماعی طور پر ایک خوبصورت معاشرتی ماحول قائم کرتے ہیں۔ ❁

عطرت بتول۔ بہت خوب لکھتی ہیں۔ بہت سرگرم رہتی ہیں۔ بچوں کے لیے بہت کہانیاں اور بڑی خوبصورت لکھ چکی ہیں۔ بڑوں کے لیے بھی دلچسپ پیرائے میں مضامین قلمبند کرتی ہیں۔ ہماری درخواست پر لاہور میں زندہ دلان کے شب برات منانے کی معلومات سے قارئینِ 'اطراف' کو آگاہ کر رہی ہیں۔ ان سے گزارش کی جاتی ہے کہ مارچ کے 'اطراف' کے لیے لاہور میں رمضان المبارک کی معلومات پر بھی ایک شگفتہ تحریر سے نوازیں۔

زمانہ بدل گیا۔ مگر حلوہ نان کی نیاز اب بھی

لاہور سے عطرت بتول کی دلچسپ تحریر

ہمارے شہر لاہور کو چونکہ زندہ دلوں کا شہر کہا جاتا ہے تو یہ کچھ غلط نہیں ہے یہاں ہر تہوار چاہے مذہبی ہو یا ثقافتی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے بڑی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں کی رونق بھی بڑھ جاتی ہے شب برات کو مساجد میں خوب چراغاں ہوتا ہے مسجد چھوٹی ہو یا بڑی برقی قمقموں سے سج جاتی ہے نوافل ادا کیئے جاتے ہیں شبینہ محافل بھی ہوتی ہیں اور پھر گھروں میں بھی عبادت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

چونکہ یہ رات بخشش، توبہ کرنے کی اور دعائیں قبول ہونے کی رات سمجھی جاتی ہے اس لیے دعاؤں میں خصوصی خشوع وخضوع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین ہوتا ہے کہ وہ دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشے گا۔

مرحومین کو یاد رکھا جاتا ہے۔ قبرستانوں میں پھول چڑھائے جاتے ہیں

اگرچہ وقت بدل گیا ہے پرانی اقدار معدوم ہو رہی ہیں لیکن پھر بھی پرانے محلوں میں ایک دوسرے کے گھر شب برات کے موقع پر حلوہ اور نان کی نیاز بھیجی جاتی ہے اندرون شہر کی تنگ گلیوں میں بچیاں سر پر چنی (چھوٹا سا گوٹے یا کرن والا دوپٹہ) سر پر جمائے ہاتھوں میں حلوے کی پلیٹیں پکڑے آس پڑوس کے گھروں پہ دستک دیتی نیاز بانٹتی نظر آتی ہیں اور کہیں کہیں دیگیں پک رہی ہوتی ہیں کہ زندہ دلان لاہور خوش خوراکی میں بھی کم نہیں ہیں اس کے ساتھ ساتھ مرحومین کو بھی یاد رکھا جاتا ہے قبرستانوں میں بھی رونق ہو جاتی ہے اپنے پیاروں کی قبروں پر پھول چڑھانے کی روایت بھی نبھائی جاتی ہے۔

ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ شب برات کا اور آتش بازی کا کیا تعلق ہے؟ شب برات کی آمد کے ساتھ ہی پٹاخوں پھلجھڑیوں، آتش بازی کا شور عروج پر ہوتا ہے، بچے تو خاص طور پر اس میں مگن ہوتے ہیں اور دیکھا دیکھی ماں باپ سے ضد کر کے پیسے لے کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں، بچپن کی یادوں میں جگمگاہٹ سی ہونے لگتی ہے جب میں بھی دوسرے بچوں کے

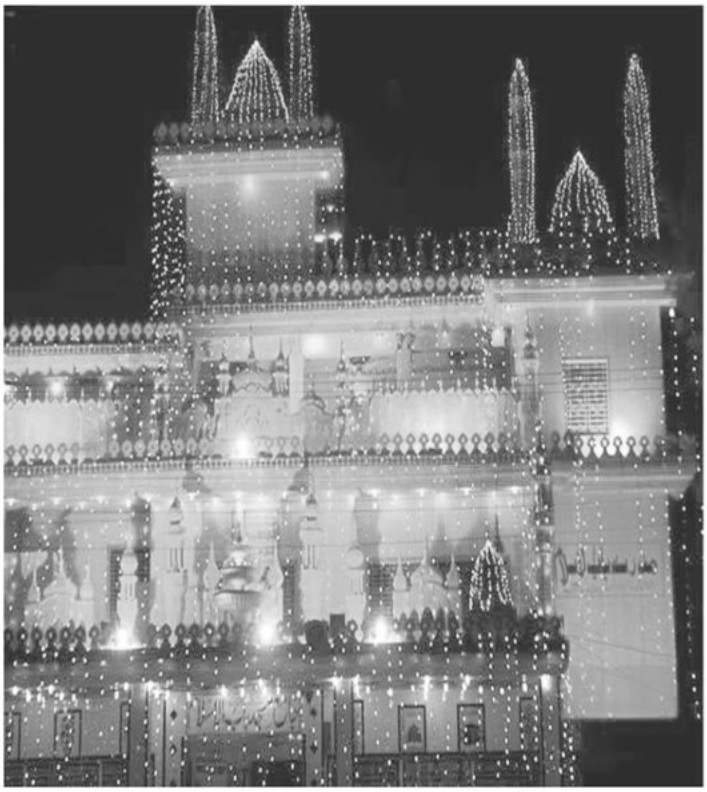

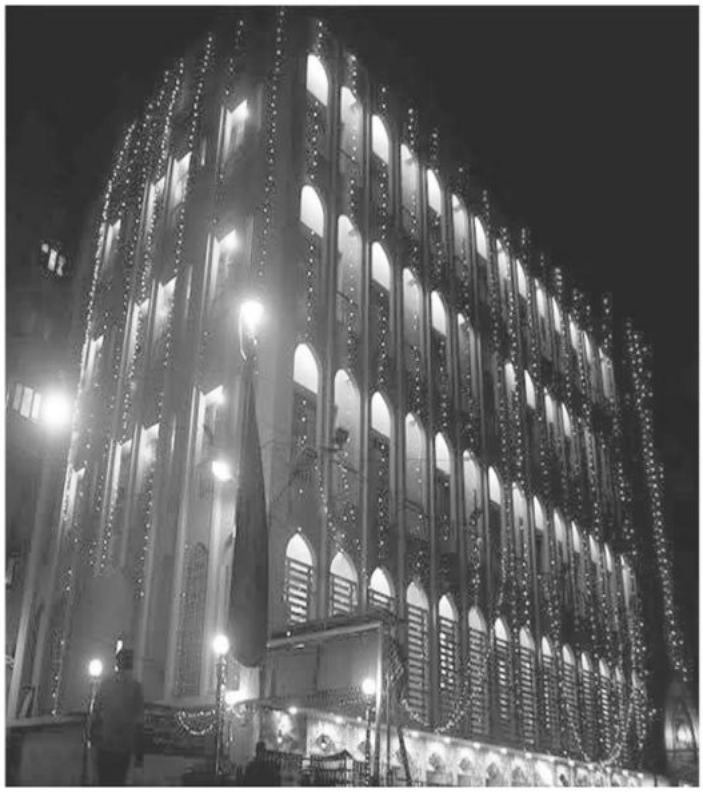

ساتھ شب برات مناتی تھی بھائی لوگوں کو شرلیاں اور پٹاخے پسند تھے شرلیاں اوپر دور تک جاتی تھیں اوپر جا کر پھٹتی تھیں اور پھر ان کی چنگاریاں سی گرتی تھیں مجھے صرف پھلجھڑیوں کا

امی اور دادی کے ساتھ نوافل۔ جتنے زیادہ نفل۔ اتنا زیادہ نیک

شوق تھا وہ ایک سرے سے جلا کر بہت ہی خوبصورت شعلہ بار پھولوں کی شکل اختیار کرتی خوبصورتی سے جلتی بجھتی مجھے بہت پسند تھیں ان مشاغل کے ساتھ ساتھ امی اور دادی کے ساتھ نوافل بھی پڑھے جاتے تھے بہن بھائیوں کا مقابلہ ہوتا تھا کہ کس نے کتنے زیادہ نفل پڑھے جس نے زیادہ پڑھے ہوتے وہ اپنے آپ کو زیادہ نیک محسوس کرتا تھا اور دوسرے بچوں پر

بھائی کو شرلیاں پسند تھیں جو اوپر دور تک جاتی تھیں

اس کا رعب پڑ جاتا تھا اور پھر رات کو چھت پر چڑھ کر بنیروں پر موم بتیاں جلائی جاتی تھیں خیر یہ تو معصوم بچپن کی باتیں تھیں اب پچھلے کچھ سالوں سے شب برات میں بھی عید کی طرح دینے دلانے کا رواج ہو گیا ہے جن لڑکیوں یا لڑکوں کی منگنیاں ہو گئی ہیں انہیں سسرال کی طرف سے شب برات کے تحائف بھیجے جاتے ہیں شادی شدہ لڑکیوں کو ان کے میکے

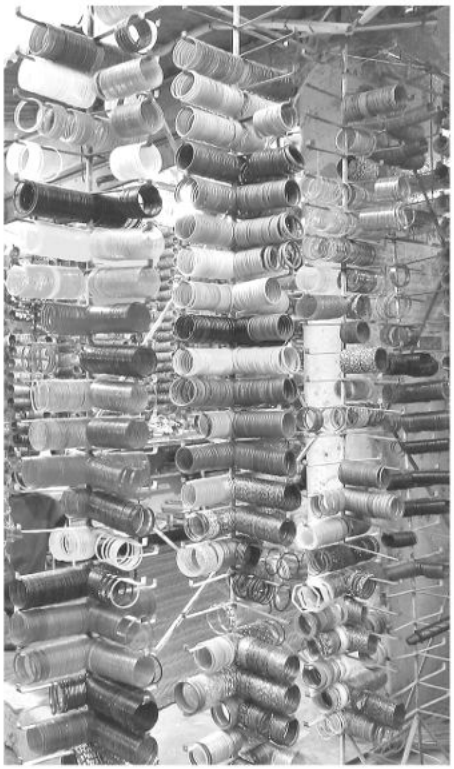

کی طرف سے سسرال جا کر شب برات دینے کا رواج بڑھ گیا ہے یعنی شب برات عبادات کے ساتھ ساتھ رسوم و رواج کے ساتھ منائی جاتی ہے بڑی مساجد میں شبینہ کی محافل پی ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ شب برات ہمارے ملک میں خوشحالی اور امن کا پیغام لے کر آئے دلوں کی کدورتیں دور ہوں سب اہل اسلام کے مسائل حل ہوں آمین ثم آمین۔ ❁

شب برات کیسے منائی جائے

نازیہ آصف۔گجرات میں 'اطراف' کی نمائندہ خصوصی ہیں۔'اطراف' کو ہمیشہ بہت اہم مضامین سے نوازتی ہیں۔زبان بہت سادہ مگر شیریں۔اطلاع زیادہ سے زیادہ۔اس بار ہم نے گجرات میں رمضان کے استقبال سے متعلق درخواست کی تھی۔انہوں نے شب برات اور رمضان المبارک کے بارے میں احادیث کے حوالے سے شب برات اور رمضان کی فضیلتیں بیان کی ہیں۔گجرات میں رمضان۔انشااللہ مارچ میں۔

دن میں روزہ۔رات میں عبادت

تحریر: نازیہ آصف، گجرات

شب برات فارسی اور عربی کے دو حروف کا مجموعہ ہے۔

شب فارسی زبان کا حرف جس کا مطلب ''رات'' اور براءت عربی زبان کا حرف ہے اس کا مطلب ہے آزادی یا چھٹکارہ پانا، اس لیے اسے لیلۃ البراءت یعنی گناہوں اور جہنم کے عذاب سے رہائی اور آزادی کی رات'' کہا گیا ہے۔

شعبان معظم کی پندرھویں شب جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت پہلے آسمان پر جلوہ افروز ہو کر پکارتی ہے ''ھل من المسترزق۔۔۔ ۔ہے کوئی جسے مجھ سے رزق چاہیے۔۔۔۔ھل من مستغفر۔۔۔ ۔کیا مجھ سے کسی کو مغفرت چاہیے۔۔۔ ہے کوئی ایسا۔۔ ہے کوئی ایسا۔۔۔یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ اس رات نبی پاک ﷺ نے طویل عبادت کی اور مجھ سے فرمایا کہ'' اس رات اللہ پاک نے میری دعا پر اتنے لوگوں کی مغفرت فرمائی جتنے بنو کلب کی بکریوں کے جسم پر بال ہیں۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا'' آج یکم شعبان ہے اور اللہ پاک نے اس ماہ کا نام شعبان اس لیے رکھا ہے کہ اس میں نیکیاں عام کر دی جاتی ہیں، حسنات کے دروازے کھل جاتے ہیں، جنت کے محلات آسان قیمت اور آسان تر اعمال سے حاصل ہوتے ہیں پس عبادت کر کے انھیں خرید لو''۔

رسول اللہ نے فرمایا'' جب نصف شعبان کی رات آئے تو اس رات کو قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو''۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ'' یہ بات ہم تک پہنچی' بلاشبہ پانچ راتوں میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔''

جمعہ کی رات، عیدالاضحیٰ کی رات، عیدالفطر کی رات، رجب کی پہلی رات اور شعبان کی پندرھویں شب (الامام شافعی الجز 1)

جدیدیت کے نام پر اس رات کا تقدس خراب کیا جا رہا ہے

قارئین اللہ پاک نے دین کو اپنی مخلوق کے لیے بہت آسان کیا ہے اس نے کتاب رحمت نازل کی تو ساتھ ہی رحمت اللعالمین نے اس کی عملی صورت بھی پیش کر دی۔ راستے کے ساتھ رہنما بھی عطا فرما دیا۔

اب ہم گناہ گار مخلوق اس کی اتنی ساری نعمتوں اور رحمتوں کے باوجود بھی ان سے مستفید نہ ہوں تو کوئی ہم سا بدنصیب کہاں ہوگا۔

حدیث مبارکہ ہے'' پندرھویں شب یا شبِ براءت ہمارے لیے خاص نعمت و رحمت ہے وہ رات جس میں ہر پیدا ہونے والے اور مرنے والے انسان کا نام لکھ دیا جاتا ہے اس رات انسان کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور تمھارا رزق اتارا جاتا ہے''۔

ہجری کیلنڈر کے اس مقدس مہینے میں عبادات کے اجر بڑھا دیے جاتے ہیں۔پس ہم پر لازم ہے کہ فضائل بھری رات کو شور وغل میں ضائع کرنے کی بجائے خالق کائنات کے حضور سربسجود ہو کر مغفرت کی دعا کی جائے۔دن میں روزہ رکھا جائے کیونکہ نبی پاک ﷺ پہ رمضان کے سوا سب سے زیادہ روزے ماہ شعبان میں رکھنا ہی ثابت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بابرکت شب میں زیادہ سے زیادہ برکات سمیٹنے کا آغاز چودہ شعبان کی نماز عصر کے بعد اعتکاف سے ہی کر دیا جاتا ہے۔رات بھر تلاوت، نوافل زکر واذکار اور تہجد کے بعد روزہ رکھا جاتا ہے۔کوشش کی جاتی ہے کہ جب اس رات اعمال نامے لکھے جائیں

شب برات کیسے منائی جائے

رزق کی تقسیم ہوتو اللہ سبحانہ تعالیٰ ہمارا شمار اپنے نیک بندوں میں کرے۔ اس کے بعد آگے دن میں بھی تلاوت ذکراذکار میلاد کی محفلیں چلتی ہیں نیاز بانٹی جاتی ہے۔بعض لوگ قبرستان جا کر اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہیں،ان کے لیے دعا مغفرت کرتے ہیں۔

مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے جدیدیت کے نام پہ اس رات کے تقدس کو بھی خراب کرنا شروع کر دیا ہوا ہے، بجائے اس کے کہ ہم اس رات اپنے اعمال صالحہ اور دعاؤں سے جہنم کی آگ کو بجھانے کی سعی کریں ہم شرلیاں، پٹاخے، پھلجھڑیاں جلا کر دوزخ کی آگ کو مزید بھڑکاتے ہیں۔ نیک اعمال اور رزق کی فراخی کی بجائے اپنے اعمال نامے میں اعمال کریہہ کی تعداد کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

آجکل تو بعض لوگ اپنی جہالت کی بنا پر اس رات کی عبادات کو بھی بدعت قرار دے رہے ہیں ان کے بقول ایسی رات کا کوئی وجود ہی نہیں،مگر ایسا کہنا کسی کی کم علمی تو ہوسکتی ہے،علم ہرگز نہیں۔

قارئین! عبادات و برکات کا یہ سلسلہ رکتا نہیں بلکہ طویل تر ہوتا جاتا ہے شب براءت کے بعد ماہ رمضان کی آمد ہوتی ہے جس کے بارے میں نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

ماہ رمضان اللہ پاک کا مہینہ ہے، شعبان میرا مہینہ ہے۔ شعبان (گناہوں سے) پاک کرنے والا مہینہ اور رمضان گناہوں کو) ختم کرنے والا مہینہ ہے۔

قارئین! اللہ پاک کے اس فرمان کے بعد روزے کی فضیلت میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔

ماہ رمضان عطیہ خداوندی ہے۔ روزہ اللہ پاک اور روزہ دار کے درمیان ایک عہد ہے۔ جس کی جزا اسے اللہ پاک ہی دیں گے۔

انسان کے لیے ماہ رمضان کی اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوگی کہ سرچشمہ نور، کتاب ہدایت کا اسی ماہ نزول ہوا۔ اس ماہ کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا جہنم سے نجات کا ہے۔

نبی پاک نے فرمایا۔ ''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے''۔ (صحیح البخاری)

قارئین سوچنے کی بات ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اکثر اپنی بداعمالیوں کا ذمہ دار شیطان کو ٹھہراتے ہیں مگر اس ماہ تو شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے یعنی انسان کے لیے اس مہینے میں فلاح ہی فلاح ہے، خیر ہی خیر ہے۔

لازم ہے کہ انسان اپنا تزکیہ نفس کرے، اپنی بداعمالیوں کا جائزہ لے، اپنا احتساب کرے اور ان بری عادات سے چھٹکارہ پانے کی بھرپور کوشش کرے۔

عموماً انسان جب کسی عبادت میں مشغول ہوتا ہے جیسے تلاوت کرنا، نماز یا ذکراذکار میں مصروف ہونا تو وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا، مگر روزہ ایک ایسی شاندار بدنی عبادت ہے کہ آپ ایک طویل وقت میں اپنی دنیاوی امور بھی نبٹاتے رہتے ہیں اور آپ ہمہ وقت عبادت میں بھی مشغول ہوتے ہیں آپ کا اعمال نامہ نیکیوں سے بھی

روزہ شاندار۔ بدنی عبادت۔ دیانتداری شرط اوّل

بھرا جا رہا ہوتا ہے لیکن امور کے نبٹانے میں دیانت داری شرط اولین ہے۔

نبی پاک ﷺ نے فرمایا

''میری امت تب تک ذلیل و رسوا نہ ہوگی جب تک ماہ رمضان کا حق ادا کرتی رہے گی۔

پوچھا گیا۔ یارسول اللہ ذلیل و رسوا کیا ہے؟

فرمایا۔ حرام کام کرنا پس تم حرام کاموں کے کرنے سے ڈرو کیونکہ جس طرح اس ماہ میں نیکیوں پہ ثواب بڑھا دیا جاتا ہے اسی طرح گناہوں کا معاملہ بھی ہے۔''

جب ہم گیارہ ماہ اپنے نفس کی من مانیوں میں گزارتے ہیں۔ سستی اور کام چوری میں کئی فرائض کی ادائیگی چھوٹ جاتی ہے تو لازم ہے کہ ماہ صیام کی آمد سے پہلے کچھ تیاری کر لی جائے، یہ تیاری جسمانی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و معاشی تیاری بھی ہوسکتی ہے۔

ضروری ہے کہ شروع سال سے ہی میانہ روی کو اپنایا جائے اور کچھ نہ

اسلام۔ تزکیہ نفس کے ساتھ تزکیہ مال کا حکم بھی دیتا ہے

کچھ پس انداز کیا جائے تاکہ اس مہینے میں یکسو ہو کر روزے کے فضائل سمیٹے جاسکیں۔

حضرت انس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ماہ صیام میں صحابہ کرام کے معمولات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''شعبان کے شروع ہوتے ہی مسلمان قرآن کی طرف جھک پڑتے ہیں اموال کی زکوٰۃ نکالتے ہیں تاکہ غریب مسکین لوگ روزے اور رمضان بہتر طور پہ نکال سکیں''۔

قارئین شعبان کی عبادات میں یہ حکمت ہے کہ اس کا نفس ان اعمال صالحہ پہ مائل ہو جائے اور رمضان کے فیوض بھرپور طریقے سے سمیٹ سکے۔

صاحب حیثیت لوگ جن پہ زکوٰۃ فرض ہے انھیں کوشش کرنی چاہیے کہ جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں تاکہ زکوٰۃ کے مستحقین بھی اپنی ضروریات سے بےفکر ہو کر اللہ پاک کے حضور ہدیہ تشکر پیش کر سکیں۔

فطرانہ بھی ماہ صوم کا اہم ترین فریضہ ہے۔ لازم ہے کہ شروع رمضان میں ہی اس کی ادائیگی کر لی جائے۔

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے صدقہ فطر کو فرض فرمایا۔ ''جو روزہ داروں کی لغویات اور بیہودہ باتوں سے پاک ہے اور غریبوں کی پرورش کے لیے ہے۔ جس نے نماز عید سے پہلے ادا کیا تو یہ مقبول زکوٰۃ ہے، جس نے نماز عید کے بعد ادا کیا تو یہ دوسرے صدقات کی طرح ایک صدقہ ہوگا۔''

گناہ چاہے ظاہری ہوں یا پوشیدہ، ان کا ارتکاب باعث گناہ و سزا ہوتا ہے اس لیے ماہ شعبان سے ہی کوشش کرنی چاہیے کہ اگر کوئی کسی قسم کے نشے، کیفین، الکوحل یا سگریٹ وغیرہ کا عادی ہے تو یہ مہینہ اس کے لیے ان برائیوں سے نجات پانے کا سنہری موقع ہے۔

ماہ شعبان کے ذکر واذکار نوافل اور نفلی روزوں (اگر جسمانی صحت اجازت دے تو) کی پریکٹس کو وقفے وقفے سے جاری رکھیں تاکہ ماہ صیام کے لیے جسم کو عادی بنایا جاسکے۔

عبادات کے ساتھ دینی کتب کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے تاکہ روزے کی فرضیت، استثنیٰ، طریقہ کار کو سمجھا جاسکے۔

ہماری برائیوں میں ایک بدترین بیماری ہوس لالچ اور ذخیرہ اندوزی بھی ہے دنیا بھر میں اس مہینے میں اشیاء خورد و نوش سستی کی جاتی ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس مہینے کو منافع کمانے کا مہینہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔ ہر چیز کی قیمت چوگنی کر دی جاتی ہے تو لازم ہے کہ مساکین کا خیال رکھا جائے اپنے افطار پارٹیوں سے ایک ڈش کم کر کے ان کے دسترخوان کو سجانے میں مدد کی جائے۔

نماز، روزہ بدنی عبادتیں ہیں جو جسم پہ فرض ہیں جبکہ زکوٰۃ اور فطرانہ مالی عبادات ہیں جو صاحب استطاعت مسلمان پہ فرض ہیں۔

یہ دین اسلام کی خوبصورتی ہے کہ تزکیہ نفس کے ساتھ تزکیہ مال کا بھی حکم دیتا ہے اور یوں مال چند ہاتھوں میں نہیں سمٹتا اور ایک فلاحی معاشرے کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

اللہ پاک ہمیں مختلف مذاہب کے ہجوم میں اس متناسب و موزوں ترین دین کو سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

جیلوں میں خواتین رمضان کیسے گزارتی ہیں

استقبال رمضان کے سلسلے میں ہمیں قدسیہ ملک صاحبہ کی مصنّفہ مرتّبہ 'قفس کہانی' میں ایک باب اہم محسوس ہوا کہ اسے ہمیں قارئین 'اطراف' کے سامنے بھی لانا چاہئے قفس کہانی میں کراچی کی جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں گزارتی خواتین کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ بہت محنت اور تحقیق کی گئی ہے۔ "ویمن ایڈ ٹرسٹ" کے ادارے کی طرف سے قیدی عورتوں کے لیے یہ جائزہ لیا گیا۔ ٹرسٹ کی طرف سے تحائف بھی تقسیم کیے گئے۔ ٹرسٹ کو عطیات دے کر آپ بھی اس کار خیر میں شامل ہو سکتے ہیں۔

قیدی خواتین کے ساتھ ساتھ جیل کے عملے کے لیے بھی تحائف

تحریر: قدسیہ ملک، کراچی

کراچی خواتین جیلوں میں رمضان کیسا گزرتا ہے؟

سال کے تمام مہینوں میں ماہِ رمضان کو جو فضیلت و برتری اور امتیاز حاصل ہے وہ وہ کسی دوسرے مہینے کو نہیں۔

مہینہ نزولِ سعادت کی یادگار ہے۔ صبر و تحمل اور ایثارِ نفس کا معلم ہے۔ اس میں جنت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ جہنم کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔ مغفرت و رحمت کی برسات ہوتی ہے، عصیاں کاروں کو راہ نجات ملتی

ناکردہ گناہوں کی مشقت میں جیل میں موجود خواتین کے لیے اُمید

ہے۔ فسق و فجور میں کمی اور اعمالِ صالحہ میں کثرت ہوتی ہے۔ تلاوتِ قرآن، ذکر و اذکار اور شب و روز مجالس تبلیغ ہوتی ہیں۔ اہل ثروت و دولت حضرات رضائے الٰہی کے لیے فرض زکوٰۃ کی ادائیگی اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ لوگ قیام اللیل یعنی نماز تراویح میں شرکت کرتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو کر دعا و مناجات کرتے ہیں، توبہ و استغفار کرتے ہیں۔ اپنی بدکرداریوں اور سیاہ کاریوں کو معاف کرا کے جنت نعیم کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یہ ماہِ ایسا مبارک ہے کہ اس میں ہر فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے اور ہر نفل عبادت کا ثواب فرض کے برابر ہے یہ صبر و غم خواری کرنے کا مہینہ ہے۔ روزہ افطار کرانا گناہوں کی مغفرت اور دوزخ آزادی کا ذریعہ ہے۔

کراچی ویمن جیل میں بھی رمضان المبارک کا آغاز جوش و خروش اور اہتمام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ویمن ایڈ ٹرسٹ کی جانب سے رمضان کے شروع ہی سے روزے کے فیوض و برکات کی بابت قیدیوں کو بتایا جاتا ہے۔ انہیں روزہ رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ رمضان میں خصوصی جذبے کے ساتھ قیدیوں کے لئے خصوصی تحائف عید گفٹس کا اہتمام کیا

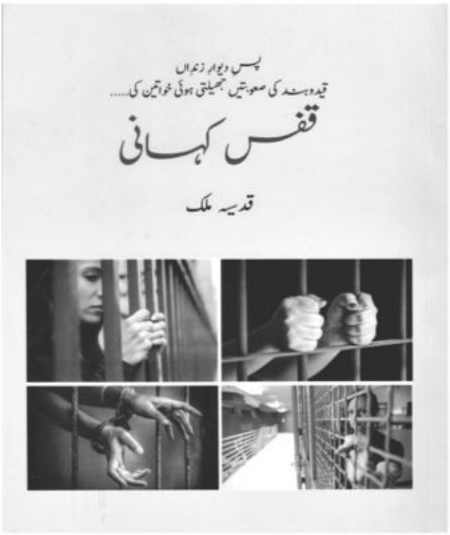

جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قیدیوں کے تحائف کے ساتھ ساتھ ویمن ایڈ ٹرسٹ جیلر مرد و خواتین وہاں موجود تمام پولیس اہلکار اور تعیناتی عملے کے لئے بھی عید گفٹس کا اہتمام کرتا ہے، جن میں بچوں اور خواتین کے لئے کپڑے، راشن جیولری وغیرہ دی جاتی ہے۔ تاکہ انکی بھی حوصلہ افزائی کی جاسکے۔ رمضان میں ویمن ایڈ ٹرسٹ کی جانب سے 20 رمضان المبارک تک قیدی خواتین کے ساتھ دورہ القرآن کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں ساتھ ہی ساتھ قیدی خواتین کی قرآن کے ذریعے

بعض خواتین سابقہ زندگی کو یاد کر کے روتی ہیں

کونسلنگ کی جاتی ہے۔ انہیں رب کی رحمت کی امید دلائی جاتی ہے۔ ان خواتین کو زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے اور برائی سے دور رہنے کے لئے خصوصی تربیت دی جاتی ہے اس کے لئے ویمن ایڈ ٹرسٹ کی جانب سے سمجھدار، باعمل معلمات، علوم قرآنی سے مکمل آگہی رکھنے والی باعلم و معزز خواتین جیلوں میں ان قیدی خواتین کی کونسلنگ کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ تاکہ قرآن و حدیث کا مستند علم ان ناآشنا خواتین تک پہنچ سکے۔ وہ جو رب کی رحمت سے مایوس ہوگئی ہیں یا کردی گئی ہیں۔ جن کو ان کے اپنے عزیزوں رشتہ داروں، اعزا و اقرباء نے چھوڑ دیا، رب کی محبت میں آجائیں اور اپنے آپ کو اکیلا و تنہا محسوس نا کریں۔ ویمن ایڈ ٹرسٹ کی جانب سے ان قیدیوں کو قرآن کے سائے میں پناہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ قیدی خواتین میں باترجمہ تراجم والے قرآن تقسیم کئے جاتے ہیں۔ بہت سی خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اس سایہ رحمت میں آکر سابقہ زندگی کو یاد کر کے بہت روتی ہیں۔ اور کچھ خواتین جو واقعی ناکردہ گناہوں کی مشقت میں جیل کی چکی میں پس رہی ہوتی ہیں انکو ایک

معزز خواتین قیدی عورتوں کی کونسلنگ کے لیے بھیجی جاتی ہیں

امید وڈھارس مل جاتی ہے۔ یہیں سے ایک اچھے مکمل باکمال حسن اخلاق سے مزین شخصیت کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے انسان وہ شاہ کلید حاصل کر لیتا ہے جو اگر فقیروں کو منگتوں کو مل جائے تو انہیں بھی شاہ وسلطان بنادے۔ ویمن ایڈ ٹرسٹ کا مقصد ہی عورتوں کے حقوق کا اسلامی تعلیمات کے مطابق شعور پیدا کرنا ہے۔ اسکے لئے ویمن ایڈ ٹرسٹ جیلوں میں اپنے پورے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنی خدمات سے دکھی انسانیت کو سکھ اور آرام دینے میں ہمہ تن مصروف عمل ہے۔ فنڈز کی کمی، ٹرانسپورٹ کے مسائل اور عام لوگوں میں جیلوں سے متعلق صحیح شعور بیدار نا ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل ہیں جن کا "کراچی ویمن ایڈ ٹرسٹ" سامنا کر رہی ہے، کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ لیکن سلام ہے ان افراد پر جو نام و نمود کی طلب سے بے پرواہ اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں تاکہ ظلمت شب کو اپنے حصے کی شمع سے روشنی کی ایک کرن دے سکیں۔ تاکہ روز قیامت بہترین لوگوں میں اٹھائے جائیں۔ بہت سے مخیر افراد ایسے بھی ہیں و ویمن ایڈ ٹرسٹ کی خواتین کو زکوٰۃ صدقات اور عطیات دیتے ہیں لیکن عام افراد میں شعور و آگہی نا ہونے کے باعث ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔

خوبصورت دل۔ بدصورت آئینہ

”ام ماریہ کاظمی کی تحریر ’اطراف‘ میں پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ مستقل ان کی تحریریں ’اطراف‘ کے صفحات کی زینت بنیں گی۔ زبان پر عبور ہے۔ جملے بہت سنبھلے ہوئے۔ الفاظ ضرورت کے عین مطابق۔ زیادہ نہ کم۔ ہے افسانہ مگر ایک تلخ حقیقت۔ جو ہمارے معاشرے میں اکثر پائی جاتی ہے۔ مختصر مگر جامع۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔“

وہ ہر بار پہلے سے زیادہ سخی مگر۔۔۔

ام ماریہ کاظمی کا افسانہ، جو حقیقت بھی ہے

وہ واحد انسان جس نے اسے کبھی خوب صورت کہا، وہ اُس کی ماں تھی۔

وہ ہمیشہ منتظر رہی، کہ کوئی صنفِ مخالف سے بھی اُسے سراہے۔ چاہے۔ لڑکپن، نوجوانی وقت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ دل میں ارماں کھلتے ہیں، اور منتظر رہتے ہیں، کسی ان سنی بات کے، ان دیکھی نظر کے۔ وہ آئینہ کے سامنے گھنٹوں کھڑی رہتی۔ وہ سجتی، سنورتی، عید تہوار سہیلیوں کے ساتھ گھومتی، شادی بیاہ میں جاتی، رشتہ داروں کے گھر دعوتیں، اس کی ہم عمر لڑکیوں کو کوئی ستائشی نگاہ، تعریفی جملہ، ڈھکے چھپے اشارے مل ہی جاتے مگر وہ۔۔ منتظر رہ جاتی۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ اپنے بہن بھائیوں سے مختلف ہے، یہ کہتے ہوئے وہ مسکراتے بھی تھے، وہ سوچتی تھی کہ اس مسکراہٹ میں وہ بات کیوں نہیں جو اس کی سہیلیوں کو ملنے والی مسکراہٹوں میں ہوتی ہے۔ جب بڑی پھپھو کے منجھلے بیٹے گھر آتے ہیں تو آپی کو دیکھ کر مسکراتے ہیں، اس مسکراہٹ میں کیا خاص بات ہے جو اسے، بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ روز شام کو اچھے کپڑے پہنتی جب ٹیوشن پڑھنے جاتی، وہاں محلے کے بہت سے لڑکے بھی آتے، مگر اس کی طرف کوئی نگاہ بھی نہ کرتا۔ اگر کبھی کوئی غلطی سے کر بھی لیتا، تو اس میں جو مسکراہٹ ہوتی، وہ اس کی تشنگی مٹا نہ پاتی۔

اور اب اس کے بیاہ کی باتیں ہونے لگیں۔ لوگ آنے جانے لگے۔ وہ ہر بار پہلے سے زیادہ سجتی، سوچتی کہ پچھلی بار کیا کسر رہ گئی تھی جو اب پوری کر لے۔ اس کی ماں، بہنیں، بھابیاں، کوئی کسر نہ چھوڑتیں مہمانوں کی خاطر داری اور اُس کی طرف داری میں، مگر نصیب کے تالے کی کنجی جس کے پاس تھی، وہ نہ مل رہا تھا۔

پھر ایک دن وہ مل گیا۔ ماں نے اُس کی بلائیں لیں، دعائیں دیں اور اس گھر میں بھیج دیا جو پہلے ہی اس کے جہیز سے بھر چکا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ آج اُسے وہ سب ضرور سننے کو ملے گا جن کے لیے اس کے کان ترس رہے ہیں، جس کے لیے اس کے بھائیوں کے کندھوں پر قرضے کا بوجھ آن پڑا ہے، اور جس کی خاطر ایک نئی چمچماتی گاڑی اس نئے گھر کے باہر کھڑی ہے۔ عجیب بات ہوئی۔ رات سے صبح ہو گئی، وہ سب ہوا جو ہوتا ہے، مگر وہ نہ ہوا جو وہ چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ پچھلے تین دن سے گھنٹوں پارلر میں گزار رہی تھی، مگر قابلِ

> **دن گزرتے رہے لیکن**
> **وہ ایک نگاہ۔ وہ بات۔۔۔**

تعریف پھر بھی نہ ٹھہری۔ رات گزری، دن گزرا، اور پھر دن رات گزرتے چلے گئے۔ وہ پورے دن اور تمام رات کوشش کرتی کہ کوئی اُسے سراہے، فقط ایک نگاہ، وہ بات، جس کی منتظر وہ کب سے ہے، اُسے مل جائے۔ مگر اُسے تو کچھ اور ہی ملتا رہا۔ قاعدے، طریقے، اصول، طعنے، ناراضگی اور بچے۔

یکے بعد دیگرے چار بچوں میں اُسے وقت کا ہوش رہا نہ اپنا۔ گھر، ذمہ داری اور شوہر کے نخرے اُٹھاتے اُٹھاتے وہ کب باجی سے آنٹی کہلائی جانے لگی، اُسے احساس ہی نہ ہوا۔ مگر رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی، تو ایک ستارہ چپکے سے اُس کی آنکھ میں آسماتا۔ کانوں میں کوئی رس گھولتا، اور وہ سمجھ نہ پاتی کہ یہ کون سی کمی ہے جس کا مداوا نہیں ہو پا رہا۔ مگر وہ اتنا سمجھ چکی تھی کہ عورت کا

> **میں تمہارے ساتھ شوہر بن کر رہ**
> **سکتا ہوں، محبوب بن کے نہیں**

دل اس کے کانوں سے جڑا ہے اور مرد کا دل اُس کی آنکھوں سے۔ شاید اسی لیے وہ اپنے شوہر کے دل تک پہنچ پائی تھی نہ اس کے دل تک کسی نے آنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اب بھی اُس نگاہ کی منتظر تھی جو بڑی پھپھو کے منجھلے بیٹے اس کی آپی پر ڈالتے تھے۔

دنیا کی نظروں میں اُس کے پاس سب کچھ تھا۔ اچھا گھر، صحت مند بچے، وفادار شوہر، خیال رکھنے والے بہن بھائی، ماں باپ کی دعائیں، مگر وہ سوچتی تھی، کہ کیا اچھے نصیب کی دعاؤں میں کسی محبوب کی محبت بھی شامل ہوتی ہے؟ اور اگر نہیں، تو ماں باپ اپنی اولاد کو محبت ملنے کی دعا کیوں نہیں دیتے؟ اگر یہی کچھ، سب کچھ ہے تو پھر وہ کیا کچھ ہے جس کی اُس کو کمی ہے۔ اگر اسی سب پر بس ہے تو بنانے والے نے یہ جذبات، احساسات بنائے ہی کیوں؟ یا کم از کم عورت جیسی شے کو کیوں دیے کہ جن کو مرد صرف اپنی خوشی کے لیے بنائی گئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ اور اس کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کہ دل کے ارمان بھی کوئی شے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی کسی پر ہے یا اس کی باز پرس ہوگی۔ تو ان پر تو کسی سے کوئی سوال بنتا ہی نہیں۔ وہ سوچتی رہتی، کہ سارے سوال مجھ ہی سے کیوں ہوں گے؟ خدا نے مجھے انسان کے بجائے مشین کیوں نہ بنایا اور اگر انسان بنا ہی ڈالا تو دل اور جذبات سے عاری کیوں نہ رکھا۔

ایک دن ہمت کر کے اُس نے یہ سوال شوہر سے کر ہی ڈالا، کہ زوج کی ستائش گناہ تو نہیں، کبھی تو، کوئی تو بات، کوئی ادا، کوئی شے اچھی لگی ہوگی۔ پھر کیا شے مانع ہے؟ اُس کے شوہر نے حیرت سے اُسے دیکھا، اور پھر یہ حیرت کی نگاہ حقارت میں بدلتی گئی۔ وہ نگاہ، اُس کی آنکھوں میں ٹھہر سی گئی، وہ لفظ اس کی سماعتوں میں اٹک سے گئے، ”کیا کروں؟ سب تو کر رہا ہوں، تمہارے لیے، بچوں کے لیے، تم سے بے وفائی بھی نہیں کی، سچ ہے کہ عورتیں بڑی ناشکری ہوتی ہیں اور اسی لیے جہنم عورتوں سے بھری ہوگی۔ بھئی تمہارے ساتھ میں شوہر بن کے ہی رہ سکتا ہوں، محبوب بن کے نہیں۔ جاو۔۔۔ جا کے آئینہ دیکھو۔“

اگلے دن وہ شوہر اور بچوں کو گھر سے رخصت کرنے کے بعد پورے دن محض آئینہ دیکھتی رہی۔ بہت غور سے، تفصیل سے، گزرتی عمر کا ثبوت بالوں اور ڈھلکتی جلد میں دیکھا۔ آئینہ میں جو نظر آ رہی تھی، وہ شاید ایسی نہ تھی کہ کوئی نگاہ اُلفت اس پر ڈالے۔ اگر آئینہ سچا ہے، تو پھر جھوٹا کون؟ اُس کی ماں؟ مگر ماں کی آنکھوں میں اُس نے جو محبت دیکھی تھی، اس میں کھوٹ بالکل نہ تھا۔ پھر کھوٹ کہاں تھا؟ کیا تھا؟ کیا آئینہ میں؟

ہاں شاید آئینہ میں کھوٹ تھا، وہ وہی کچھ دکھا رہا تھا جو اُس کے اندر تھا، بدصورتی، شاید لوگ بھی اس آئینہ کی طرح تھے، وہ بھی وہی کچھ دیکھتے تھے جو ان کے اندر تھا، بدصورتی، وہ الجھ کر رہ جاتے اُس کی چھوٹی آنکھوں، بھدی ناک اور موٹے ہونٹوں میں، وہ دیکھ ہی نہ پاتے کہ اس کے پاس خوبصورت دل ہے، اخلاق ہے، وفا ہے اور محبت ہے۔ وہ غور سے دیکھتی رہی، آئینہ بدصورت تھا، پھر اُس کے کانوں میں اپنی ماں کی آواز گونجی،

ارے دیکھو تو، میری بیٹی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے!“

عمر کا سورج

’عمر کا سورج‘ اب دوبارہ پاکستان میں طلوع ہو رہا ہے۔ مگر دلچسپی اسی طرح ہے۔ زندگی کا قافلہ کہاں کہاں سے گزرتا ہے۔ پاکستان کی صف اوّل کی سینئر صحافی ناول نویس سعیدہ افضل کی آپ بیتی پاکستان کے ابتدائی برسوں کی ثقافت۔ معاشرت۔ رہن سہن کی تصویریں پیش کر رہی ہے۔ محققین کے لیے اس میں بہت حوالے ہیں۔ بہت ڈیٹا ہے۔ ’اطراف‘ کے قارئین ’عمر کا سورج‘ بہت غور اور لگن سے پڑھ رہے ہیں۔ مگر رائے لکھ کر بھیجنے کی عادت نہیں ڈال رہے ہیں۔ آپ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے۔

لندن سے واپس آتے ہی ہم دونوں بہنیں سیالکوٹ چلی گئیں

قسط نمبر 16

☆ سعیدہ افضل کی خودنوشت

ہمارے وطن لوٹنے کی اطلاع سبھی کو تھی، ماموں رفیق جن کی پوسٹنگ اب سیالکوٹ میں تھی اپنی بیگم کے ساتھ۔ کراچی آئے ہوئے تھے، ماموں دانش اور پھوپھی دلشاد تو پہلے سے ہی ہمارے فریئر روڈ والے فلیٹ میں قیام پذیر تھے، دادا دادی ہم سے ملنے کراچی نہیں آ سکتے تھے لہٰذا ڈیرہ سے اکبر چچا اور چھوٹی پھوپھو یعنی میری بوا کندن آ گئیں تو گھر میں رونق دوبالا ہو گئی۔

یوں لگتا جیسے چاہنے والوں کا میلہ لگا ہو اتنے اپنوں کا پیار پا کر میں لندن کی رونقیں اور اسکول کی چہل پہل کو بھلا کر مِتروں کی محبت

بزداروں کی شادی۔ جھومر رقص۔ طوطڑیاں شہنائیاں

بھری مسکراہٹوں میں کھو گئی۔

ان سبھی اپنوں نے میرے بچپن کے دنوں کو یادگار بنایا اور میری شخصیت کو نکھار دیا زندگی بھر میں نے ہمیشہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے مثبت رویے ہی دیکھے، کبھی کسی کا ایک دوسرے کے لئے نے منفی طرزِ عمل میرے سامنے نہیں آیا، اک دوجے کے لئے جیسے ان کے دلوں میں محبتوں کے سمندر موجزن ہوں۔ رشتوں کا احترام جیسا اپنے خاندان میں پایا کہیں اور نہ پایا، تبھی میری شخصیت، میری سوچیں مثبت خطوط پر استوار ہوئیں۔ میں نے کسی سے جھگڑنا یا نفرت کرنا نہیں سیکھا۔

دادا دادی چاہتے تھے کہ ہم ڈیرہ غازی خان آ جائیں وہ ہمارے لئے اُداس تھے۔ جبکہ ڈیرہ میں کوئی انگلش اسکول نہیں تھا۔ وہاں چھٹی جماعت سے انگلش پڑھائی جاتی تھی، لہٰذا جب رفیق ماموں اور پھوپھی سردار بیگم واپس سیالکوٹ جانے لگے تو والد سے کہا، سعیدہ کو ڈیرہ نہ لے جاؤ... وہاں اسکی تعلیم کا ہرج ہوگا بلکہ اسکے ساتھ عزیزہ کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دو۔ میں دونوں کا داخلہ کانونٹ اسکول میں کرا دوں گا۔ یوں ہم دونوں بہنیں سیالکوٹ چلی گئیں۔

جیسز اینڈ میری سیالکوٹ کی ’نن‘ بچوں پر کڑی نظر رکھتی تھی

سیالکوٹ میں جیسز اینڈ میری برصغیر میں (پاکستان کی جانب) انگریزوں کا بنایا ہوا پہلا قدیمی کانونٹ اسکول تھا جو ایک خوبصورت کلاسک قسم کی عمارت میں قائم تھا، وہاں مجھے تیسری کلاس میں داخلہ ملا۔

میری کلاس ٹیچر ایک ادھیڑ عمر ’’نن‘‘ تھی وہ ہماری کلاس کی نگراں بھی تھی۔ننوں والا مخصوص لباس پہنتی تھی گوری چٹی مگر سپاٹ چہرے والی جو بچوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتی تھی، ہر روز یونی فارم کا پیاں کتابیں رائٹنگ وغیرہ چیک کرتی، کہیں بچوں کے لباس پر یا کہ کاپیوں پر کوئی دھبہ، پنسل کا کوئی مارک نہ لگا ہو۔ ایسے بچوں کی سرزنش ہوتی۔ جو’’ ان ٹائی ڈی‘‘ ہوتے یا کاپی کے صفحہ پر اپنے ہاتھوں پر کوئی دھبہ یا نشان لگا لیتے۔ دراصل یہ خاتون کلاس میں اس قدر ڈسپلن چاہتی تھی کہ بس سانسوں کی آواز سنائی دے اور بچے سر جھکائے نک سنک سے درست سکول ورک میں منہمک رہیں۔ وہ دبے قدموں بچوں کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی.... مجھ کو یہ روبوٹ سی استانی بالکل نہ بھائی۔ اس اسکول میں راولپنڈی کے کانونٹ اسکول جیسا ماحول نہیں تھا جہاں ہماری کالی کلوٹی موٹی کرسچن ٹیچر تھی مگر بہت ہمدرد قسم کی، نرم لہجے والی، خوش مزاج اور بچوں میں ہر دل عزیز۔ میں تو اسکی منظورِ نظر اور چہیتی اسٹوڈنٹ تھی، سیالکوٹ کے ’’جیسز اینڈ میری‘‘ میں میرا دل نہ لگا یہاں میری کوئی

سعیدہ افضل اپنے جیون ساتھی۔ مرحوم اعجاز قادر قریشی کے ساتھ۔ (ڈیرہ غازی خان)

دوست یا سہیلی بھی نہ بن پائی، بس سکول میں دم گھٹا گھٹا ہی رہتا۔ اب مجھے ڈیرہ یاد آتا میں اپنے آبائی گھر دادا دادی کے پاس جانا چاہتی تھی جو گھر میرے بچپن کا گہوارہ تھا۔

سچ ہے کچھ لوگ بچپن کے سنہرے دنوں میں جیتے ہیں اور عمر کے کسی حصے میں بھی اِس دور کی باہوں سے نکلنا نہیں چاہتے جس میں ان کے پیاروں کی یادیں رہتی بستی ہیں۔ ان کے اندر کا گزرا ہوا ہر لمحہ تاحیات جاگتا اور سانس لیتا رہتا ہے شاید کہ میں انہی لوگوں کی طرح ہوں جن کو پرانے لوگ، پرانی اشیاء، پرانی عمارتیں، اور پرانے رستے، نئی نویلی چیزوں سے زیادہ لبھاتے ہیں۔ تبھی اسکول میں اور پھر آگے چل کر، کالج اور یونی ورسٹی میں میری سہیلیاں مجھ سے کہتی تھیں کہ تمہارے اندر کوئی بوڑھی روح رہتی ہے۔ کبھی شوخ رنگ کپڑے نہیں پہنتی ہو نہ کبھی زور سے ہنستی ہو، وہ جب کسی مزاحیہ بات پر قہقہے لگا تیں، میں بس مسکرا کر رہ جاتی۔ میرے رشتہ دار بیرون ملک سے آکر وہاں کی خوبصورتیوں کو یاد کرتے مگر میں تو کراچی آکر بہت خوش تھی کہ حال کو پیچھے چھوڑ کر پھر ماضی میں واپس آ گئی تھی۔

اپنے فریئر روڈ والے گھر کی اُسی گیلری (بالکونی) میں جو میری دنیا،

اُردو فرفر بولتی۔ روہتکی بھی سمجھ لیتی

میری کل کائنات تھی۔ والد صاحب ہمیں اپنے والدین سے ملانے کو ڈیرہ جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ دادا کا خط آ گیا دادی بیمار تھیں، میرے والد کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی لہذا وہ ہم کو فوراً ڈیرہ غازیخان لے آئے، اور میں یہاں آکر بھی خوش ہو گئی۔ بابا نے ہمارے ساتھ کچھ دن ڈیرہ میں قیام کیا۔

ایک روز دادا نے بتایا کہ انکی بہن مراد خاتون جو بزداروں میں بیاہی ہوئی تھیں انکی بیٹی لعل بی بی کی شادی ہے شادی کا بلاوا مراد خاتون کے بیٹے چراغ بزدار اور موسیٰ بزدار دینے آئے تھے۔

یہ خبر سن کر میں تو نہال ہو گئی۔ اب ہم تین روز بعد شادی میں بزداروں کی بستی جا رہے تھے جو شہر ڈیرہ سے غالباً دو میل دوری پر

سعیدہ افضل

نہر کے اُس پار آباد تھی۔ یہاں ہمارے دادا اور دادی کے رشتہ داروں کا ایک بڑا بزدار قبیلہ تھا۔ جن کے کھیت اور زمینیں دُور دُور تک تھیں یہ زرخیز زمینیں تھیں نہر قریب ہونے کی وجہ سے انکی کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میں بچپن میں بہت دفعہ یہاں جا چکی تھی، یہ بہت مہمان نواز لوگ تھے۔ روایت پرست بھی تھے، دراصل تو یہ میری دادی کے رشتہ دار تھے۔ ان کے بڑے کنبوں پر مشتمل تمام رشتہ داروں کے گھر ایک ہی احاطے میں بنے ہوئے تھے جس کو یہ حویل (حویلی نہیں) کہتے تھے کیونکہ حویل بڑا ہوتا ہے اور حویلیاں چھوٹی ہوتی ہیں۔

یہاں کی خاص بات یہ تھی کہ شادیوں پر خوب دھوم دھڑکا ہوتا تھا کھانا بھی بے حد لذیذ پکوایا جاتا کیونکہ دیگوں کے لئے اپنے باڑے کے پلے ہوئے جانور کاٹے جاتے جن کا گوشت بہترین قسم کا ہوتا۔

دوسری خاص بات شادی پر جھومر رقص کا اہتمام ہوتا، نوناری طوطڑیاں، شہنائیاں اور خاص قسم کے ساز بجائے جاتے نیز ریچھ اور کتوں کی لڑائی کرائی جاتی جو بچوں کے علاوہ بڑوں کے لئے بھی اُن دنوں پُرکشش بات تھی۔

حویل سے باہر ایک طرف قطاروں میں دیگیں پک رہی ہوتیں اور ''جھومری'' تلواروں سے جھومر ڈالتے۔ یہ رقص دیکھنے والا ہوتا تھا۔ شادی والے گھر کے سامنے میدان میں دائرے کی صورت بہت سی بلند قامت چار پائیاں جنہیں ''ہماچے'' کہتے ڈال دیتے، اسی پر مہمان براجمان ہوتے، تب کرسیوں کا رواج نہیں تھا۔

محفل جم جاتی تھی ریچھ اور کتوں کی لڑائی کی ابتدا ہوتی، ریچھ کو ایک کھونٹے سے باندھ دیتے اور اس پر تین یا چار خونخوار کتے چھوڑ دیتے جو بار بار اس پر جھپٹتے۔ ریچھ بچارا تو بندھا ہوتا وہ کتوں سے خود کو بچاتے بچاتے ہلکان ہو جاتا اور ہانپنے لگتا۔ اسکی سانسیں تیز ہو جاتیں اور زبان باہر نکل آئی۔ کتے بھی اچھل اچھل کر تھک جاتے ریچھ کے پنجوں سے ان کو گہری خراشیں آجاتیں اور وہ زخمی ہو جاتے تبھی یہ تماشہ بند کرا دیا جاتا یہ عجیب تماشہ ہوتا تھا تھرل سے بھرا ہوا اور اس دور کے لوگ ایسے خونی تماشوں سے بھی تفریح کا مزہ لیتے اور ان لڑائیوں، پر شرطیں لگاتے تھے۔

میں ریچھ سے بہت ڈرتی تھی پھر بھی یہ کھیل دیکھتی تھی۔ جب بھی بزداروں کی بستی میں کوئی تقریب ہوتی دادا یا بابا کے ساتھ ضرور جاتی۔ یہ کھیل بچپن میں کئی بار دیکھا۔ اپنے بابا کے ساتھ ہماچے پر بیٹھ کر۔ ان کے کندھے کے پیچھے سے چھپ کر، تاکہ ریچھ مجھے نہ دیکھ سکے۔ تب، اس وقت مجھے ریچھ سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ کیوں کہ بابا

ڈیرہ غازی خان اسکول اتنا شور مچا کہ میں چکرا گئی

کے پاس بندوق ہوتی تھی اپنے باپ اور بندوق دونوں کی وجہ سے اس خوف بھرے ماحول میں بھی مجھ کو تحفظ کا احساس رہتا تھا۔

کچھ دن ڈیرہ رہ کر میرے والد کراچی چلے گئے۔ مجھے اور عزیزہ کو اماں نے گورنمنٹ پرائمری سکول نمبر 4 میں داخل کرا دیا۔ کیونکہ یہی ایک سکول ہمارے 3 بلاک والے گھر کے پاس تھا، ڈیرہ میں ایک بھی پرائیویٹ اسکول نہیں تھا۔ یہ اسکول پانی والی ٹینکی کی گولائی کے بالکل سامنے کونے کی ایک بلڈنگ میں تھا جو کسی ہندو کی ملکیت ہو گی اور اب متروکہ املاک کی فہرست میں شامل تھا۔

پانی والی ٹینکی سے دوسری جانب اگلے تمام بلاک تقسیم سے قبل ہندوؤں کے رہائشی محلے تھے۔ بٹوارے کے بعد ہندو اپنے گھر چھوڑ کر چلے گئے اور ان خالی مکانات میں بھارت سے آئے مسلمان، مہاجرین کو آباد کر دیا گیا تھا۔ ان مہاجرین میں روہتک سے آئے لوگوں کی تعداد کافی تھی۔

ان مہاجرین کی فیملیز کی بہت سی بچیاں لوکل بچیوں کے ساتھ اسکول نمبر (4) چار میں داخل تھیں، کراچی میں رہنے کی وجہ سے میں فر فر اردو بول سکتی تھی اور روہتکی بھی سمجھ لیتی تھی، یوں بولنے میں مجھے ان کے ساتھ کوئی دقت نہ ہوتی۔ لٹے پٹے خاندانوں سے آئی لڑکیوں کے گھروں میں بھی جاتی تب ڈیرہ میں ہندوؤں کے بہت سے گھر دیکھنے کو ملے۔

ہمارے سکول میں اِن دنوں بچیوں کو گھروں سے سکول لانے اور واپس گھر تک پہنچانے کی ذمہ داری سکول میں ملازم رکھی گئی ''مائیوں'' کی ہوتی۔ صبح کے وقت ہر بچی کے گھر سے طالبات کو لانا اور چھٹی کے

میری ماموں زاد، بچپن کی سہیلی شمیم دانش جو فروری 2023 میں وفات پا گئیں

وقت ان کے گھروں کو پہنچا دینا۔ ہر گھر کے دروازے یا ڈیوڑھی سے وہ صدا بھی لگاتیں کہ گھر والو آپ کی بچی کو میں نے پہنچا دیا ہے۔ڈیرہ کے سارے گرلز اسکول میں یہی سسٹم رائج تھا لیکن میں اپنے پرانے ملازم بجّر کے ساتھ اسکول جاتی اور واپس آتی تھی۔

گورنمنٹ کے اس پرائمری اسکول میں میرا پہلا دن بڑا عجیب تھا، کلاس روم میں قدم رکھتے ہی گھبرا گئی، میں نے لندن کا پرائمری سکول دیکھا تھا۔کراچی میں بھی پڑھا اور راولپنڈی اور سیالکوٹ میں بھی کانونٹ اسکولوں سے تھوڑا تھوڑا عرصے تعلیم پائی۔مگر یہ تو ڈیرہ غازیخان تھا۔کلاس ٹیچر کرسی پر بیٹھی تھیں اور تمام بچیاں فرش پر بچھے رسی سے بنے کھردرے ٹاٹوں پر دو قطاروں میں براجمان تھیں، ان کی کتابیں کپڑے کے رومالوں میں بندھی ہوئی تھیں جن کو ''بستہ'' کہا جاتا تھا۔ان کے بستے سلیٹیں قلم دوات ان کے سامنے دھرے تھے۔کا پیوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ٹیچر نے اشارہ کیا ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں ایک کونے میں جہاں جگہ خالی تھی فرش پر بچھے ٹاٹ پر بیٹھ گئی۔ لڑکیوں نے کتابیں کھول کر اپنے سامنے رکھ لیں اور سبھی باآواز بلند کو رس کی صورت میں رٹا لگانے لگیں۔جلال پور جٹاں، جلال پور جٹاں، جلال پور جٹاں۔گویا کہ وہ کسی شہر یا قصبے کو اسکی کسی خصوصیت کے سبب ہل ہل کر یاد کرنے لگیں، اس طرح ایک زبان ہو کر کہ کلاس روم میں ایک شور سا گونجنے لگا یہ شور سن کر مجھے لندن کے اسکول میں شور مچانے والا پیریڈ چل رہا ہو اور میرے کان Make a noise too, Make a noice too کی صدا سن رہے ہوں۔تبھی انہوں نے صفحہ اُلٹا اور کتاب پر نظریں جما کر یاد کرنے لگیں۔

کھیلوں کے سامان کے لئے سیالکوٹ، سیالکوٹ، سیالکوٹ مشہور ہے۔مشہور ہے

اس گردان سے مجھے چکر سا آ گیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی ساتھ والے کلاس رومز سے بھی پڑھائی کے ایسے ہی شور وغوغا سے غلغلہ مچا تھا تبھی

میری پھوپھی مرحومہ دلشاد بیگم مسز دانش ڈیروی

میری سب سے چھوٹی پھوپھی کندن بی بی

ٹیچر میری جانب متوجہ ہوئیں۔

کیا ہوا تم کو بچی؟ ادھر آؤ میرے پاس۔کیا طبیعت خراب ہے، وہ خود ہی اُٹھ کر میرے پاس آ گئیں اور مجھے فرش سے اٹھا کر اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔پوچھا۔

پہلے کہاں پڑھتی تھیں۔

لندن میں۔میں نے جواب دیا۔

وہ جہاں دیدہ میری کیفیت سمجھ گئیں۔ایک کرسی منگوائی اور اپنی کرسی کے پاس رکھوا دی انہوں نے مجھے اپنے پاس ہی کرسی پر بٹھا دیا۔

اس ٹیچر کا نام تھا ''میمنت سلطانہ'' یہ نام آج بھی میرے دل پر لکھا ہوا ہے۔وہ افغانستان کے آس پاس کے کسی علاقے سے تھیں۔

'اودیس سے آنے والے بتا' نظم کی ٹیبلو کے لیے ریہرسل

ازبکستان-کرغستان کہ آذربائیجان-اللہ جانے لیکن مجھے اب ان کے ملک کا صحیح نام یاد نہیں ہے۔تاہم یہ یاد ہے کہ وہ فارسی بان تھیں۔اور ان کو انگلش آتی تھی۔ عرصہ قبل انکی فیملی کے لوگ ملک کے دگرگوں حالات کی وجہ سے ہجرت کر کے انڈیا آ بسے تھے، یہ یہاں کی لوکل ٹیچرز سے بالکل مختلف اور ان کا وسیع ویژن تھا جو میرے لئے باعث راحت تھا۔وہ مجھے آدھی چھٹی میں الگ سے انگلش پڑھاتیں۔

پورا سال اس ٹیچر نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا کر چوتھی اور پانچویں جماعتیں مکمل کرائی اور میں سالانہ امتحان میں اول نمبر پوزیشن لائی جس پر اسکول میں میری واہ واہ ہو گئی۔

یہ غالباً 1954 سے 1955 کا زمانہ تھا، سوئے اتفاق بعد کو غالباً 2002ء میں جب میرے بیٹے حیدر اعجاز کی پوسٹنگ فیصل بیس پی اے ایف کراچی میں ہوئی اور حیدر کے آفیسر کمانڈر سے ملاقات ہوئی ڈیرہ غازی خان کا تذکرہ چلا تو وہ بولے۔میری بہن میمنت سلطانہ وہاں ٹیچر ہوا کرتی تھیں۔

جی ہاں۔۔میں ان کی شاگردرہ چکی ہوں، میں نے خوش ہو کر کہا۔وہ بہت اچھی ٹیچر تھیں، وہ بھی اپنی بہن کی تعریف سن کر خوش ہوئے۔

مس میمنت سلطانہ، اب کہاں ہیں؟ میں نے پوچھا۔

ان کا انتقال ہو گیا ہے، یہ سن کر میں بہت افسردہ ہو گئی تھی۔

جیسے خانہ بردوش ہوتے ہیں (یعنی خانہ بدوش) اسی طرح ''سکول بردوش'' بھی ہوتے ہیں۔یہ کہنا چاہیئے کہ اُن کا سکول ان کے کندھوں پر رہتا ہے اور وہ اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔میں بھی سکول بردوش کسی ایک شہر میں ٹک کر نہ پڑھ پائی۔میں نے پانچویں پاس کی تو پتہ چلا بابا نے کراچی میں نزد یکی صدر میں فریئر روڈ والا گھر فروخت کر دیا ہے۔یہ گھر بک گیا تو دانش ماموں کو اپنی رہائش کا انتظام کرنا تھا، انہوں نے اپنے پھوپھی زاد سید منظور شاہ کے مکان میں رہائش اختیار کر لی کیوں کہ منظور شاہ بیمار تھے اور وہ ہمیشہ کے لئے کراچی چھوڑ کر ڈیرہ غازیخان اپنے آبائی گھر ''درزی والا'' پر جا رہے تھے انہوں نے اپنا مکان ماموں کے سپرد کر دیا تھا۔یہ گھر پاکستان چوک دکنی مسجد کے ساتھ تھا تبھی میرے والد نے انکی رہائش کے قریب عارضی طور پر ایک گھر لے لیا تا کہ قربت رہے اور ہم کو کراچی بلوا لیا۔

ان دنوں پاکستان چوک کے قریب ایک بڑی بلڈنگ ہوا کرتی تھی جس میں برٹش کونسل کی بڑی سی لائبریری تھی، اسی جانب ایک بلڈنگ میں فاطمہ ثریا بجیا اپنی فیملی کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔انور مقصود اور ان کی بہنیں سبھی ساتھ رہتے تھے۔بجیا کی خوبصورت سی گوری چٹی ایک بہن تھیں جو ہمیشہ غرارہ جمپر پہنتی تھیں۔ان کا نام فردوس تھا۔بجیا ثریا کے گھر کے سامنے ایک پرائیویٹ اسکول تھا جس کی ہیڈ مسٹریس مس برنی تھیں اور آپا فردوس بھی اسی سکول میں پڑھاتی تھیں وہ ہماری کلاس ٹیچر تھیں۔میں نے اسی سکول سے چھٹی

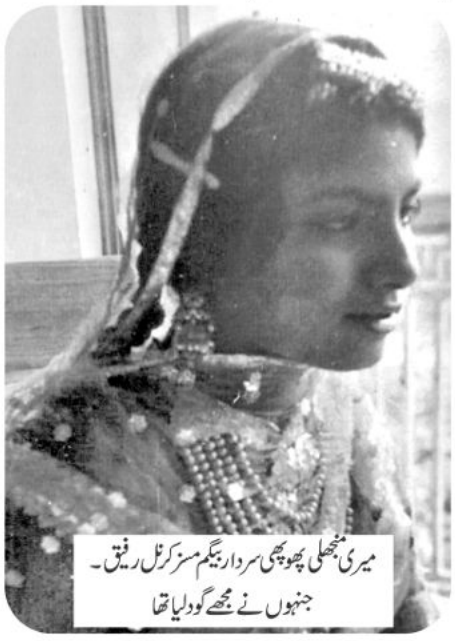

میری منجھلی پھوپھی سردار بیگم مسز کرنل رفیق۔ جنہوں نے مجھے گود لیا تھا

اور ساتویں پڑھی آپا فردوس کبھی کبھار مجھ کو اپنے گھر بھی لے جاتیں کیونکہ اسکول میں فنکشن ہونا تھا جس کی تیاری آپا فردوس کے ذمے تھی وہ ایک نظم پر ٹیبلو کی ریہرسل کروا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ کو پوری نظم یاد کروائی تھی۔ اب صرف ایک آدھ شعر ہیں یاد رہ گیا ہے

اودیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پن گھٹ پر
پن ہاریاں پانی بھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے
ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
اودیس سے آنے والے بتا

یہ ایک بہت خوبصورت نظم کسی مشہور شاعر کی ہے۔ شاعر کا نام یاد نہیں آ رہا، (یہ اختر شیرانی کی نظم ہے۔ مدیر) بہر حال ٹیبلو میں اس نظم کو مجھے پڑھنا تھا اور پن ہاریوں کی ٹولی کی مکھی بھی میں ہی تھی۔ ہم لڑکیوں نے پنہاریوں کے روپ میں گاگرے، کرتیاں اور چوڑیاں پہنی تھیں سروں پر مٹی کی مٹکیاں رکھی تھیں اور اسٹیج پر ایک مصنوعی کنواں بھی تیار کیا گیا تھا، غرض آپا فردوس نے بہت خوبصورت ٹیبلو تیار کرایا تھا، وہ میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آیا کرتی تھیں میں ان کی پسندیدہ شاگرد تھی، جب عزیزہ کے لئے ٹیوشن کا مسئلہ آیا تب ہم روز شام کو ان کے گھر ٹیوشن کے لئے جاتے ان کی ایک بہن عزیزہ کو ٹیوشن پڑھاتیں اور میں ساتھ بیٹھی رہتی۔ کیونکہ ہمارا گھر نزدیک ہی تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ عزیزہ مجھ سے ٹیوشن نہیں پڑھتی تھی۔

جب میں ساتویں میں تھی ایک روز ہیڈ مسٹریس نے مجھ سے کہا، کیا تم دوسری شفٹ کی بچوں کو پڑھا لوگی؟

جی پڑھا لوں گی۔ میں نے جواب دیا تھا۔

اسکول کی دوسری شفٹ دوپہر سے شام کے پانچ چھ بجے تک ہوتی تھی۔ مجھے پانچویں چھٹی کے بچوں کو اُردو اور حساب پڑھانا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ جس اسکول میں، میں صبح کو طالبہ کی حیثیت سے پڑھنے آتی تھی شام کو وہاں بطور ٹیچر پڑھاتی تھی اور لڑکے لڑکیاں مجھے 'مس' کہہ کر بلاتے اگر کبھی یہ لڑکے سڑک پر مل جاتے تو ٹیچر، ٹیچر کہہ کر پکارتے کر مجھے بلاتے تب مجھ کو راہ گیروں سے جھینپ آتی۔

بعد میں جب میں نے 1960ء میں میرے والد نے اسی علاقے میں سے فریئر روڈ پاکستان چوک کے پاس فاروق منشن نامی بلڈنگ میں کیفے سعدی کے اوپر فرسٹ فلور کا فلیٹ لیا تب بھی میں آپا فردوس سے ملنے ان کے گھر جاتی تھی یہ ان دنوں میں کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی، اور بجیا کی چھوٹی بہن زہرہ نگاہ جو شاعرہ ہیں مجھے پہلی بار ریڈیو پاکستان کراچی ایک ادبی پروگرام میں اپنے ساتھ لے کر گئی تھیں۔ اس پروگرام میں 'ناصر جہاں' بھی تھے جو ہر محرم کو ''شام غریباں،، میں مرثیہ ''گھبرائے گی زینب'' اپنی خوبصورت پرسوز آواز میں پڑھا کرتے تھے تو سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔ ہر محرم کی نویں پر میری والدہ شام سے ہی ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتی تھیں۔ یہ مرثیہ ناصر جہاں کی پرسوز آواز میں سنتی تھیں اور آنچل سے اپنے بہتے آنسو پونچھتی جاتی تھیں۔

مجھے وہ اپنی ماں اور نانی کا بے تابی سے سید ناصر جہاں کی ''شام

صبح کو اسکول میں طالبہ، شام کو وہیں ٹیچر

غریباں'' کے انتظار میں ریڈیو کے سامنے پروگرام کا منتظر رہنا یاد آتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

آہ۔۔۔ کہاں گئے وہ میرے سارے پیارے لوگ میں جن سے محبت کرتی تھی اور جو مجھ سے محبت کرتے تھے جن کی محبت کی روشنی

بچپن میں جنہوں نے مجھے گود لیا تھا
پھوپھی سردار بیگم مسز کرنل رفیق

نے مجھے رشتوں کا احترام سکھایا وہ میرے دادا دادی، نانی، اماں اور بابا پھوپھیاں، ماموں، چچا چچی سبھی تو پیار کرنے والے اس جہاں سے چلے گئے، اور مجھ سے بچھڑ گئے اور میں اس دنیا میں ادھوری ہو گئی... بالآخر میرے رفیق زندگی اعجاز قادر صاحب بھی چلے گئے۔ انکی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

سب چلے گئے دادا، دادی، نانی، اماں، بابا اور رفیق زندگی اعجاز قادر

کیا خوب کہا ہے خواجہ غلام فرید نے....

جیون ڈیہہ اڈہائی وے یار
سٹ گھت، فخر وڈائی وے یار

ترجمہ۔

زندگی تو بس دو چار دنوں کی ہے اے میرے دوست یہ تو بہت مختصر اور فانی ہے اس پر غرور کرنا اور اترانا چھوڑ دے۔

کتھ رانجھن، کتھ کھیڑے بھیڑے
کتھ رہ گئے وہ جھگڑے جھیڑے
کتھ چوچک دی جائی وتے یار
گئے سب جھوک لڈائی وی یار
(چوچک دی جائی۔۔یعنی چوچک کی بیٹی ہیر سیال)

انکی یہ غزل بہت خوبصورت ہے جب دل اُداس ہو جاتا ہے یہ غزل پڑھتی ہوں اور امی کو یاد کرتی ہوں جن کو یہ کلام پسند تھا بھی سوچتی ہوں۔

انسان کو کسی شے سے لگاوٹ نہ رکھنا چاہیے۔ اب لوگوں سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی ہوں اور جن سے محبت کی ان کو بھی بھلا دینا چاہتی ہوں۔ بھلا نہیں سکتی، یادیں دل سے جاتی نہیں۔ پیارے لوگ چلے جاتے ہیں ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔

اب عالم یہ ہے جو چیزیں دوسروں کے لئے کے قیمتی اور اہم ہیں وہ مجھے معمولی لگتی ہیں اور جو میرے لئے معمولی ہو چکیں لوگ ان کو قیمتی سمجھتے ہیں زندگی کی ڈھلتی ہوئی شام کو ایسے جیتے مرتے... جی لینا کتنا مشکل ہے پھر جی کے بہلانے کو کچھ اس قسم کے شعر لکھتی ہوں۔

بات سے بات بنانے والے پیارے لوگ
ہنس کر دکھ دے جانے والے پیارے لوگ
خوابوں میں آجاتے ہیں بہلانے کو
جا کر پھر نہ آنے والے پیارے لوگ

جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں اُن تک تو کوئی قاصد بھی نہیں پہنچ سکتا۔

کملی کر کے چھوڑ دیتو ئی
بیٹھی لکھ لکھ گلیاں دے رولاں
آپ جاواں کہ میں قاصد بھیجاں
میرا تھی گیا حال بیماراں

میں جانتی ہوں رانجھے دوسری دنیا میں چلے جائیں تو سند سے نہیں آتے۔ خود ہی جانا پڑتا ہے۔

کتھ اُومکر فریب دا چارا
کتھ وٹ جوگی مُندراں والا
پرم چڑی جیس لائی وو یار

ترجمہ: وہ پریم کی چالیں اور مُندرا کان میں ڈال کر جوگی کا روپ دھارنے والا کہاں چلا گیا جس نے ہیر کے دل میں محبت کی چنگاری سلگائی، مگر اس سے ملنے خوشبو و مشک میں بسی ہوئی ہیر سیال کا جل سرخی مہندی سے سنگھار میں شنگری جو سرمے کی سلائی سے بالوں میں مانگ نکالتی تھی، بالآخر خود چلی گئی اور اُسے جاتے کسی نے نہ دیکھا، محبت کے دنیاوی روپ اور حسن کی پرچھائیاں سب جھوٹی ہیں یہ سب فنا ہو جانے والے سائے ہیں باقی رہ جانے والی بس خدا کی ذات ہے، رانجھا چلا گیا اور ہیر بھی چلی گئی سبھی چلے گئے، کسی دن ہم نے بھی چپکے سے چلے جائیں گے آج تم ہکل ہماری باری ہے۔ قائم رہنے والی بس خالق کائنات ہی کی ذات ہے، ہاں بس یہی حقیقت ہے یہی زندگانی ہے باقی سب فسانہ ہے، کہانی ہے۔ (جاری ہے) ❁

"غزالہ خالد' نے 'اَن کہی' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں پر قلمبند کی۔ اور قارئین کا اپنا ایک حلقہ اثر قائم کیا۔ 'اطراف' کی درخواست پر انہوں نے ہر ماہ پرنٹ اور ڈجیٹل کے امتزاج کا تجربہ شروع کیا۔ جوں جوں 'اطراف' ڈجیٹل ہو رہا ہے۔ Feel Like کا حصّہ بھی بڑھ رہا ہے۔ ان کی تحریر میں شگفتگی ہے اور اپنا ایک الگ راستہ۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔"

لاس اینجلس کی آگ۔ غزہ پر حملے کا بدلہ؟

تحریر: غزالہ خالد

آگ کا کیا ہے پل دو پل میں لگتی ہے
بجھتے بجھتے ایک زمانہ لگتا ہے

بس یہی لاس اینجلس میں ہوا دیکھتے ہی دیکھتے آگ بڑھتی چلی گئی اور ہزاروں گھروں کو جلا کر خاک کر دیا، آگ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں لگی تھی تو شکر ہے کہ ہلاکتیں کم ہوئیں خدانخواستہ ہم جیسا ملک ہوتا تو

ٹرمپ بابا کی باتیں کرتے کرتے بیل بیچ میں آ گیا

قیامت سے پہلے ہی قیامت آجاتی۔ امریکہ کا بھی بھاری مالی نقصان ہوا لیکن افسوس ہماری قوم نے اس سانحے پر وہی کیا جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے تھا یعنی کچھ لوگوں نے Feel like خوش اور پرسکون کیا۔

ظاہر ہے جو قوم اپنے بزرگوں سے "اللہ کرے دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں" جیسے کوسنے اور بددعائیں سن سن کر بڑی ہوئی ہو وہ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہے کہ آرام سے بستر میں لیٹ کر اور کمبل میں گھس کر ہاتھ میں پکڑے موبائل میں جلتے ہوئے گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہے اور Feel like "فاتح" کرے کہ دیکھو غزہ پر حملے کا بدلہ لے لیا ناں!

سوشل میڈیا پر یہ سب دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ کچھ سال پہلے سنتے تھے کہ آئندہ جنگیں سوشل میڈیا پر لڑی جائیں گی یقیناً اب وہ وقت آچکا ہے اور شنید ہو کہ ہم اس جنگ میں ہار بھی چکے ہیں بلکہ چاروں خانے چت پڑے ہیں۔

ادھر ٹرمپ بابا نے حلف اٹھالیا ہے دیکھتے ہیں اب کیا ہوتا ہے! ہماری ایک طرحدار سابق سفیر نے ٹرمپ کی حلف برداری کے موقع پر کہا کہ "امریکہ میں سردی کی خبر پر ساری دنیا کو چھینکیں آجاتی ہیں" تو اب دیکھتے ہیں کہ ٹرمپ کی حلف برداری کے بعد دنیا کتنی تبدیل ہوتی ہے اور ہمیں کتنا فائدہ یا نقصان ہوتا ہے اتنا تو ہمیں پتہ ہے کہ ہم سے بے رخی تو وہ برت نہیں سکتے لیکن ہمیں کچھ Feel like "خدشہ" ہو رہا ہے کہ "کہیں اس قدر بھی نہ چاہیں کہ دم ہی نکل جائے"۔

دم نکلنے پر ایکسپو سینٹر کراچی میں ہونے والی مویشیوں کی نمائش کا موٹا تازہ بیل یاد آگیا جس کا کرنٹ لگنے سے دم نکل گیا خبر سن کر دکھ ہوا کہ انتظامیہ کی لاپرواہی کے سبب یہ حادثہ پیش آیا لیکن پھر جب یہ سوچ کر Feel like اطمینان ہوا کہ بیل پر ہی ٹلی اگر کرنٹ لگنے سے انسانوں کو کچھ ہو جاتا تو دس بارہ لاکھ ہرجانہ انہیں واپس نہیں ہو سکتا تھا۔ ارے یہ بیل تو یونہی درمیان میں آگیا ہم ٹرمپ کی بات کر رہے تھے کہ ٹرمپ بابا نے صدارت سے پہلے ہی کچھ وعدے بھی کر لئے تھے اور کچھ خبرداری نوٹس بھی جاری کر دئے تھے کہ غیر قانونی رہنے والے باشندوں کی سب سے بڑی ہجرت ان کے اس دور میں ہوگی اب انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

فلسطین اور اسرائیل کی جنگ بندی کا کریڈٹ بھی وہ خود لے رہے ہیں جنوری کی سب سے بڑی خوشخبری ہی یہ تھی کہ غزہ میں جنگ بندی ہوگئی ہے دونوں طرف کے قیدی رہا کئے جا رہے ہیں اور اس پر بھی کچھ لوگ سوشل میڈیا پر جشن منا رہے ہیں یعنی پھر وہی بغیر سوچے سمجھے Feel like تک "دھنا دھن" ہو رہا ہے اور ہماری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ جب تنازع اپنی جگہ موجود ہے تو ایسی جنگ بندی کا کیا فائدہ!! بس اللہ آگے کی خیر کرے۔

جنوری میں ہمارے ملک کا دردناک واقعہ مراکش کشتی حادثہ تھا جس نے دل دکھا دیا۔ آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے خواب سجائے نوجوان کس طرح اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے بہت افسوس ہوا۔ ابھی یونان کشتی حادثے کی تحقیقات مکمل نہیں ہو سکی تھیں کہ یہ ایک اور حادثہ ہو گیا بقول شاعر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اسی طرح نوجوانوں کو غیر قانونی طور پر باہر لیجانے والوں کا بھی ایک مضبوط نیٹ ورک ہے جب تک اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا یہ سب ہوتا رہے گا اس کے علاوہ عوام کو بھی باشعور ہونے کی ضرورت ہے جوان کے لگائے گئے جال میں اپنی مرضی سے پھنستے ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ انجام یہ بھی ہو سکتا ہے۔

والدین بچوں کی تعلیم پر نہ توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی پیسہ لگاتے ہیں لیکن ان ایجنٹوں کو بخوشی لاکھوں روپیہ دیکر موت خرید لیتے ہیں۔ کچھ پڑھے لکھے نوجوان بھی ملک میں نوکری نہ ملنے کی صورت میں شارٹ کٹ ڈھونڈتے ہیں بہرحال یہ حکومت کی ہی ذمہ داری ہے کہ اس طرح غیر قانونی جانے والوں کے نیٹ ورک کو توڑے اور انہیں قرار واقعی سزائیں بھی ملیں۔

ہم بھی انسان ہیں کچھ بھی Feel like کر سکتے ہیں جیسا کہ سزا کے ذکر پر ایسے ہی بس "ایویں" خیال آگیا کہ ہمارے ملک میں سزائیں صرف سیاست دانوں کو ہی کیوں ملتی ہیں؟ ورنہ تو کیمرے کی آنکھ، موبائل کی آنکھ اور انسانی آنکھ کے سامنے جرم کرنے والے بھی انگلیوں سے "وی" کا نشان بناتے ہنستے مسکراتے Feel like "معصوم معصوم" کرتے چھوٹ جاتے ہیں یعنی برق گرتی ہے تو بیچارے سیاستدانوں پر !

والدین بچے کی تعلیم پر پیسہ نہیں لگاتے لیکن ایجنٹوں کو لاکھوں دے کر موت خریدتے ہیں

آخر کیوں! وجہ جو سمجھ آتی ہے وہ "ایویں" بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ انجام کا سوچ کر ہی Feel like نجانے کیا کیا ہو جاتا ہے اسی لئے عزت پیاری ہے تو بھیا ہم بھی چپ اور آپ بھی چپ۔

بقول پروفیسر عنایت علی خان صاحب

پھر تو تم سر پہ اٹھالو گے زمانے بھر کو
سر اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

❀❀❀

فروری کا اشفاقیہ

محمد اشفاق بدایونی کچھ عشرے پہلے کراچی کی ادبی محفلوں کی جان ہوتے تھے۔ اب وہ جدّے سے کراچی آتے ہیں۔ بلکہ حملہ کرتے ہیں۔ وہ آیا۔ اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا کے مصداق وہ اب کراچی کے ادبی حلقوں پر دوبارہ غالب ہو رہے ہیں۔ 'یارانِ نکتہ داں کے لیے' کے بعد اس کے بطن سے جنم لینے والا ناولٹ 'عابد اسکوائر' لکھنے پڑھنے والوں کو مبہوت کرگیا ہے۔ ان کا ماہوار کالم پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

دھرنا۔ جس میں بندوں کو گننے کے لیے ڈھونڈنا پڑتا ہے

اشفاق بدایونی۔ جدہ

جمہوریت ایک ایسا طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا جبکہ دھرنا ایک ایسا احتجاجی طرز ہے کہ جس میں بندوں کو گِننے کے لیئے ڈھونڈنا پڑتا ہے

جمہوریت میں بندوں کی گنتی کے پیچھے عوام کی اکثریت کی طاقت ہوا کرتی ہے اور دھرنوں کے پیچھے خفیہ ہاتھ ہوا کرتے ہیں اور یہ خفیہ ہاتھ اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ ان پر ہاتھ ڈالنا مقتدر اداروں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بسا اوقات ایک ان دیکھا ہاتھ طرفین کے ہاتھوں سے ہاتھ ملائے ہوئے ہوتا ہے

دھرنا دینا عوام کا جمہوری اور سیاسی حق ہے اسی لیئے دھرنا دینا کوئی

> دھرنے کے نام پر کچھ افراد کروڑوں کی آبادی کا نظام تہس نہس کر دیتے ہیں

جرم نہیں ہاں دھرنے کی آڑ میں ملکی املاک کو نقصان پہونچانا، یا، امن و امان کی صورتِ حال کو خراب کرنا اگر دھرنے کا مقصد بن جائے تو مقتدر اور با اختیار اداروں اور شخصیتوں کو دھرنے پر ہاتھ ڈالنا پڑ جاتا ہے اور ماتحت ہاتھوں سے لاٹھی چارج، آنسو گیس، واٹر کینن، ربر بلٹس چلوانی پڑ جاتی ہیں اور اگر ان ساری چیزوں سے دھرنا نہ بکھرے تو اس سے بھی زیادہ شدید اور جان لیوا منصوبوں پر عمل کیا جاتا ہے جس سے دھرنا ختم ہو یا نہ ہو کچھ لوگوں کی زندگیاں ضرور ختم ہو جاتی ہیں بندوق کی نالی سے نکلنے والی گولی یہ نہیں دیکھتی کہ مرنے والا قصوروار ہے یا نہیں اور پھر پلک جھپکتے میں مرنے والوں کا جُثہ اور قصہ نظروں سے اوجھل کروادیا جاتا ہے غرض یہ حادثاتِ زندگی ہیں اور ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں

> بندوق کی نالی سے نکلنے والی گولی نہیں دیکھتی کہ مرنے والا قصوروار ہے یا نہیں

ہمارے ذاتی مشاہدات کے مطابق سب سے پہلا دھرنا ''ابلیس نے دیا تھا کہ آدم خاکی کا پتلا مجھ سے بنوایا اور میں ہی اُسے سجدہ کروں سو اس دھرنے کی پاداش میں اللہ نے اُسے بزم ملائکہ سے راندۂ درگاہ کردیا تھا سو آج بھی دھرنے کی فلاسفی کم وبیش ویسی ہی ہوتی ہے بس اعتراضات تبدیل ہوجاتے ہی ویسے سماجی حوالوں سے اگر دیکھا جائے تو یہ منطق میں نہیں آتی کہ دھرنے کے نام پر کچھ افراد جمع ہوکر تین چار کروڑ کی آبادی کے شہر کو اور اسکے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔

دھرنے کے پیشِ پردہ اور پسِ پردہ محرکین یہ بھول جاتے ہیں کہ انکا احتجاج حکومتی صاحبانِ اختیار کے خلاف ہوتا ہے ہے اور چین اور سکون وہ پورے شہر کا برباد کردیتے ہیں۔

ہمیں دھرنے اور اسکی اصطلاحی حیثیت پر کوئی اعتراض نہیں مگر دھرنا ہو تو ایسا ہو کہ دھرنے میں تلِ دھرنے کی جگہ نہ ملے یہ کیا کہ دھرنے میں شرکاء احتجاج سے زیادہ تماشائی، یوٹیوبر اور چینلز کے نمائندوں کا اژدھام ہوتا ہے۔

یہ دھرنا بھی کوئی دھرنا ہوا کہ خود تماشہ ہوئے اور خود ہی تماشائی بنے۔

ہم کسی مخصوص دھرنے کی نشاندہی کر کے کسی دھرنے کی مخالفت یا حمایت کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے کہ بلا وجہ کسی دھرنے کے الزام میں ہم دھر لیے جائیں۔

آپ لوگ میرے اس مشاہدے سے اتفاق کرینگے کہ ہمارے ملک میں آج تک جتنے بھی دھرنے ہوئے ہیں ان میں سے ہر دھرنے کے انجام میں لوگوں کو بس تتر بتر ہوتے دیکھا۔

ہاں سرِ آئینہ تو دھرنا ہوتا ہے مگر پسِ آئینہ کچھ اور ہوتا ہے جسکو عوام الناس کی تسلی اور تشفی کے لیئے مذاکرات کا نام دیا جاتا ہے اور یہ معنی مذاکرات بھی خوب ہوتے ہیں کہ بظاہر تو ناکام ہوتے ہیں مگر معاھدہ ہوجاتا ہے اور دھرنا اپنا وجود دکھو دیتا ہے اور دھرنے

کے شرکاء ''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' کے مصداق اپنی غربت، اپنی پریشانیوں اور اپنے روزمرّہ کے معمولات واپس آجاتے ہیں اور دھرنوں کے ارباب اپنے مفاد حاصل کرلیتے ہیں اور دھرنے کے غریب شرکاء پھر نانِ شبینہ کو ترستے رہتے ہیں جو بظاہر انکا مقدر نظر آتا ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

❀❀❀

حکومت سندھ۔ محکمہ اطلاعات کی سابق ڈائریکٹر مہناز حسن کی خود نوشت کی پہلی قسط نے ہی قارئین 'اطراف' کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ آئندہ اقساط کا بے تابی سے انتظار ہے۔ ان کی یادداشت لائق رشک۔ زبان سادہ اور وہ جن برسوں میں ہمیں ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔ بہت اہم ہیں۔ دائیں بائیں کی کشمکش۔ این ایس ایف اور اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان نظریاتی جھڑپیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

سرسید گرلز کالج کا نظم وضبط۔ مسز سلمٰی زمن کی کاوشوں کا مظہر

دوسری قسط

مہناز حسن، محکمہ اطلاعات حکومت سندھ کی ڈائریکٹر کی کہانی ان کی اپنی زبانی

میں نے میٹرک 1972 میں نمایاں پوزیشن سے پاس کیا تو سرسید گرلز کالج جو میری رہائش گاہ سے بالکل پیدل کا راستہ تھا وہاں بآسانی داخلہ مل گیا۔ یہ کالج کراچی کا بہترین کالج تصور کیا جاتا تھا جس کا ڈسپلن مسز زمن کا مرہونِ منت تھا۔ نصابی اور غیر نصابی دونوں شعبوں میں اس کالج نے اپنے جھنڈے گاڑے ہوئے تھے۔

کہاں اسکول اور کہاں کالج لائف ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمیں بے لگام

اخبار کا نکلنا تھا۔ جمعیت کی طالبات سامنے آگئیں

چھوڑ دیا گیا ہو یقیناً یہ اسکول کا ڈسپلن اور فیصلہ سازی کی تربیت تھی کہ اس آزادی میں بھی بے شمار پابندیاں تھیں جو تھوڑے عرصے کے بعد ہمیں کالج میں بھی محسوس ہونے لگی تھیں۔

مسز سلمٰی زمن ایک ماہر تعلیم، مستعد و منظم پرنسپل تھیں جن کی نگاہیں انفرادی طور پر ہر طالبہ پر رہتی تھیں مجال تھی جو کوئی لڑکی ان کی نگاہوں سے بچ کر رہتی۔ حدود و قیود پر عمل کروانا مسز زمن کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ تعلیم اور تعلیمی اداروں کا تقدس کیسے قائم کیا جاتا ہے یہ جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کون لڑکی کہاں بیٹھی ہے کیوں بیٹھی ہے کلاس میں کیوں نہیں گئی ان کو سب کو اطلاع ہو جاتی تھی اور وہ رنگے ہاتھ اس لڑکی کو پکڑ لیتیں۔

میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے نہ صرف مسز زمن کا زمانہ دیکھا بلکہ شعبہ صحافت کراچی یونیورسٹی میں ان کے شوہر محترم مختار زمن کے علمی اور تجرباتی لیکچرز سے بھی استفادہ کیا۔ پاکستان کی محبت سے سرشار زمن صاحب نے بی بی سی سے صرف اس لیے استعفیٰ دیا کہ وہاں پر محمد علی جناح کو قائد اعظم کہنے کی ممانعت کی گئی تھی بعد میں وہ APP کے بیورو چیف تھے شعبہ صحافت میں 1979 کے دوران اعزازی لیکچرر کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ ان کی کلاس اگر دو گھنٹے کی بھی ہوتی تو کوئی اسٹوڈنٹ کلاس چھوڑ کر گیا ہو وہ جس جذبہ اور انہماک سے پڑھاتے تھے 100 فیصد اسٹوڈنٹس کو اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ کتنا وقت گزر گیا۔

ہم خیال لڑکیوں کو ملا کر اخبار 'شفق' نکالا مفت تقسیم کیا

بات ہو رہی تھی سرسید کالج کی۔ مجھے اسکول سے ہی تقریریں کرنے کا بڑا شوق تھا سو یہاں بھی موقع ملتے ہی اپنا شوق پورا کرنے میں لگ گئی۔ لیکن گھر کی طرف سے اتنی اجازت نہ ملی کہ میں دور دراز علاقوں کے اداروں تک جاؤں اور وہاں کے مقابلوں میں شرکت کروں۔ شاذ و نادر ہی میں کالج

سرسید گرلز کالج میں تقریر کرتے ہوئے

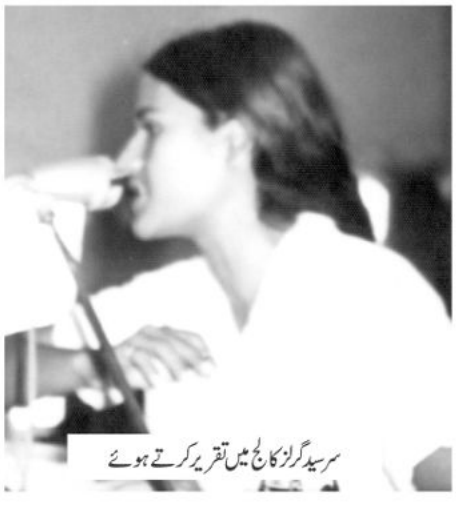

سے باہر کسی دوسرے کالج میں مقابلہ میں شرکت کی غرض سے گئی۔ کالج کی دوسری ٹیمیں جس میں ملکہ جعفری۔ فرحت عظیم۔ ندیم زہرا وغیرہ دوسرے تعلیمی اداروں میں کالج کا نام روشن کر رہی تھیں۔

پاکستان کی مشہور و معروف شخصیت پروفیسر پرویز ہڈ بھائی کی بہن نفیسہ ہڈیو

میں نے نفیسہ ہوڈ بھائی کے ساتھ کالج میں این ایس ایف کو متعارف کروایا

بھائی انگریزی کی Debater تھی میری کلاس فیلو تھی تب ہی میری اس سے دوستی ہوگئی اس دوستی کی وجہ ہماری مشترکہ سوچوں کا ہونا تھا۔ ہم نے جلد ہی کالج میں NSF کو متعارف کرانا شروع کر دیا۔ نفیسہ اس کام میں زیادہ متحرک تھی اور اسی کی ہمراہی میں میرے قدم بھی سیاست کے میدان کارزار میں بڑھنے لگے۔ اسی کی فرمائش پر میں پہلی دفعہ بنارس کے علاقے میں یکم مئی کے مشعل بردار جلوس میں شریک ہوئی یہ اور بات ہے کہ جب گھر والوں کو بتایا تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا گیا۔ میں نے کارل مارکس کو پڑھنا نفیسہ کی صحبت میں شروع کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام اب میرے محسوسات اور جذبات کو بھڑکانے لگا تھا۔ کارل مارکس کی کتابیں ماں، قافلہ شہیدوں کا اور دوسری تحریریں پڑھ کر کارل مارکس کا فلسفہ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اسی دوران ہم نے کالج کی اور دوسری ہم خیال لڑکیوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے ایک چھوٹا 4 صفحات کا اخبار نکالا جس کا نام "شفق" تھا جو ہم مفت تقسیم کیا

نسرین زہرا۔ نفیسہ۔ لالہ رخ انصاری کی آمد سے ہمارا گھر این ایس ایف کا مرکز بن گیا

کرتے تھے۔ اس میں میرے مضامین بھی ہوا کرتے تھے۔ اخبار کا نکلنا تھا کہ ہماری شامت آگئی۔ جمعیت کی طالبات ہمارے سامنے آگئیں ہماری ان سے تلخ کلامی ہوئی تو میں نے بغیر سوچے سمجھے ان سے کہہ دیا کہ باہر نکلو پھر بتاؤں گی۔ آج جب اپنے اس جملے پر غور کرتی ہوں تو خود پر ہنسی آتی ہے کہ۔ کیا پدّی کیا پدّی کا شوربہ۔ جملہ بہرحال قابل اعتراض تھا۔ کئی معنے لیے ہوا تھا اس کے کئی منفی پہلو سامنے آرہے تھے بات پرنسپل تک پہنچ گئی اس وقت مسز زمن کا تبادلہ

ہو چکا تھا اور مسز نسیم شاہ پرنسپل تھیں۔ پرنسپل کے آفس میں میری ٹھیک ٹھاک سرزنش ہوئی اور مذکورہ جملے کی برابر تکرار ہو رہی تھی۔ اب میرے

صحافت سے دلچسپی اپنے ماموں حسن عسکری کی بدولت ہوئی

دماغ ٹھکانے آرہے تھے یہ تو بڑی غلط بات کر دی میں نے۔ ظاہر ہے میرا کوئی مقصد تو تھا نہیں بس حریف پر اپنا رعب ڈالنا تھا سو اب بھگتنا تو تھا۔ اپنے کہے کی معافی مانگی بلکہ لکھ کر دیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ نفیسہ رسالپور گئی ہوئی تھی یہ سب کچھ مجھے اکیلے ہی برداشت کرنا پڑا۔ نتیجتاً ہمارا اخبار بند کر دیا گیا۔

میری رہائش کالج کے بالکل سامنے ہی تھی اس لیے آنا جانا بہت آسان تھا۔ کالج کے گھنٹے کی آواز گھر تک آتی تھی۔ نفیسہ اکثر میرے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ امتحان قریب ہوتے تو چھٹیوں میں صبح 8 بجے ہی وہ میرے گھر آجاتی اور ہم اکٹھا پڑھا کرتے تھے اور وہ رات 10 بجے واپس جاتی بعض دفعہ تو گھر والے پریشان ہو جاتے اور کہتے "کیا آج وہ گھر نہیں جائے گی۔"

میرے گھر کے قریب نسرین زہرا جن کا تعلق NSF ہی سے تھا لیکن وہ سینئر تھیں جب انہیں نفیسہ کا پتہ چلا تو وہ بھی لالہ رخ انصاری جنہیں ہم لالی کہا کرتے تھے ہمارے گھر آنے لگیں۔ میرا گھر اب NSF کا مرکز بن گیا تھا۔

آج میں ان تینوں دوستوں کو بہت یاد کرتی ہوں۔ نفیسہ اور لالی نے تو

میں اب بھی اخبار انٹرنیٹ پر نہیں پڑھتی

اپنے من پسند شعبہ صحافت میں بڑے طویل عرصہ خدمات انجام دیں اللہ مغفرت کرے لالہ رخ انصاری کم عمری میں داغِ مفارقت دے گئیں نفیسہ BBC سے منسلک ہوئیں تو امریکہ کی اڑان بھری۔ نسرین شادی کر کے کراچی سے باہر چلی گئیں میں نے کراچی یونیورسٹی کا رُخ کیا۔ کیسی سیاست کہاں کا NSF سب کچھ اچانک ختم ہو گیا۔

صحافت سے تعارف

صحافت سے دلچسپی میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی درحقیقت اس کا سہرا میرے چھوٹے ماموں سید حسن عسکری مرحوم کے سر جاتا ہے۔ میں غالباً تیسری کلاس میں تھی جبھی ایک دن اچانک پتہ چلا ماموں جان انڈیا سے آرہے ہیں۔ میرے والدین 1947 میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے۔ ماموں جان انڈیا میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تھے وہاں بڑے ماموں بھی تھے انہوں نے خاندانی زمینداری سنبھال لی تھی۔ میرا پورا ننھیال دھدیال ہندوستان ہی میں تھا۔ خاندان کے تمام افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے جن کا تعلق بہار سے تھا۔ میرے ابا مرحوم سیاسی مزاج کے حامل تھے مسلم لیگ کے رکن تھے جوانی میں سیاست کا جنون انہیں پاکستان لے آیا۔ والدہ مرحومہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں مجھے یاد ہے وہ اپنی والدہ کو یاد کر کے روتی تھیں۔ 1947 سے لیکر 1998 تک وہ کبھی ہندوستان نہیں جا سکیں گھر اور بچوں کی ذمہ داری نے انہیں اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ کبھی اپنی ماں سے مل سکتیں۔ زیادہ تر لوگ انڈیا ہی میں رہ گئے۔ آج جبکہ ہم آزاد وطن میں رہتے ہیں رشتوں کی کمیابی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہ بٹوارہ انسانی رشتوں کو تقسیم کر گیا۔ اور اب جبکہ 75 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے ہم تہی داماں ہیں جو بچے کھچے رشتے تھے وہ سب داغ مفارقت دے گئے۔

بات ہو رہی تھی صحافت میں آنے کی۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر دیکھا ماموں جان آگئے ہیں۔ عسکری مرحوم ہندوستان سے انگریزی لٹریچر میں آنرز کر کے آئے تھے انڈیا کے گورنر ذاکر حسین نے انہیں گولڈ میڈل

ابا اور ماموں کے درمیان انگریزی تلفظ پر شرطیں لگ جاتیں

دیا تھا۔ ہم سب ماموں کو گھیرے بیٹھے تھے اور وہ اپنی بہن کے گھر میں خوش و شاداں گھر کے معاملات بڑی حد تک تبدیل ہو رہے تھے۔ پہلی پہل ہم سب بڑے ابا یعنی اپنے تایا کا آنا جانا دیکھتے تھے جو آرمی میں ہونے کی وجہ سے پاکستان آگئے تھے اور پنڈی میں رہتے تھے کراچی وہ ہمارے ہی گھر آتے تھے اب اچانک ماموں جان آگئے تو یہ اضافہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ اسکول جانے کا قطعی دل نہیں چاہتا لیکن ماموں جان کے کہنے پر ہم اسکول چلے جاتے تھے دن رات بڑے خوبصورت ہو گئے تھے۔

اب ماموں جان اکثر ہمیں انگریزی پڑھانے لگے تھے ان کا سارا زور انگریزی پڑھانے پر لگ گیا تھا۔ میرے تقریر کرنے کے شوق کو بھی ماموں جان کی رہنمائی حاصل ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ جب میں 'نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" کے موضوع پر اسکول میں تقریر کی تیاری کر رہی تھی انہوں نے ہی میری تقریر لکھوائی تھی اور اس میں ایک انگریز ادیب کا شاید وہ روزویلٹ کا کہنا تھا۔

"EVERY MAN IS THE ARCHITECT OF HIS OWN FORTUNE"

خوب رٹوا دی تھی۔ میری تقریر سب کو بہت پسند آئی لیکن میں تیسرے نمبر

زیادہ تر رشتے دار بھارت میں ہی رہ گئے تھے

پر آئی تو پتہ چلا اُردو کی تقریر میں انگریزی کے استعمال سے میرے نمبر کٹ گئے ہیں۔

مجھے پہلی دفعہ ماموں جان پر غصہ آنے لگا۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کی وجہ سے میں تیسرے نمبر پر آئی ہوں اس کے بعد میں نے تقریر کی حد تک ان سے مدد لینا چھوڑ دیا۔

ابا اور ماموں جان کے درمیان اکثر و بیشتر انگریزی کے تلفظ پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی شرطیں بھی لگ جاتی تھیں اور طے پاتا جو شرط جیتے گا وہ جلیبیاں کھلائے گا۔ جلیبیاں زیادہ میرے والد ہی کو کھلانا پڑتیں۔

ماموں جان بڑے عرصے تک بے روزگار رہے اس کے باوجود میں نے کبھی بھی یہ نہیں دیکھا کہ میرے والدین کے درمیان گھریلو اخراجات پر کوئی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ والد مرحوم کے ماتھے پر میں نے کبھی بھی کوئی بل آتے نہیں دیکھا۔ امی تو خیر بہن تھیں ابا کو بھی اپنے سالے سے بڑا پیار تھا۔ دو تین سال کے بعد ماموں جان چٹا گانگ چلے گئے پھر جب دوبارہ واپس آئے تو وہ وہاں سے صحافت میں ماسٹرز کر کے لوٹے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ PPI سے منسلک ہو چکے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے ہمارے گھر میں ڈان اخبار آنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ اخبار پڑھنے کے بعد بڑے سلیقے سے تہہ کر کے رکھتے تھے اگر ہم میں سے کوئی اس ترتیب کو خراب کرتا تو اس کو خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔ ہم کئی بھائی بہن تھے لیکن ڈان سے لگاؤ مجھے ہی تھا اس کے باوجود کہ انگریزی پر کوئی عبور بھی نہ تھا لیکن اخبار پڑھنے کی عادت پڑتی جا رہی تھی جو آج تک جاری ہے آج جبکہ انٹرنیٹ کا دور ہے میں نے کوئی اخبار نیٹ پر نہیں پڑھا۔ اب بھی میرا دن اخبار پڑھنے سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ماموں جان کی وجہ سے دیگر رسائل و جرائد بھی آنے لگے تھے ہمارے ہاں ان کا ڈھیر لگ جاتا تھا میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان کو ردّی میں بیچا گیا ہو۔

یہ تمام رسائل و جرائد مقدس اوراق کی طرح بڑے ترتیب کے ساتھ رکھے جاتے تھے۔ میں ان تمام سے خوب استفادہ کرتی حالانکہ اس وقت تک میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب میرے دل میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے مضمون لکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ سوچ کر کہ میرا مضمون بھی ان اخبار و جرائد میں چھپے گا تو کتنا اچھا ہوگا میں نے ماموں جان سے اس کا اظہار کیا۔

ماموں جان انگریزی صحافت سے وابستہ تھے اور میں رہی اُردو میڈیم تو انہوں نے اس سلسلے میں میری کوئی خاص ہمت افزائی نہ کی بلکہ وہ میری انگریزی نکھارنے میں لگے رہے اور اس وجہ سے اب میں ان سے دور بھاگنے لگی۔ لیکن پھر بھی انہی کی وجہ سے میرے مضامین مختلف اخباروں میں چھپے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب میری توجہ اُردو اخباروں کو تلاش کرنے لگی ابا دفتر سے واپسی پر نئی روشنی، لایا کرتے تھے۔

اس وقت جب ایک کمانے والا اور سب کھانے والے ہوں ایک اخبار چاہے وہ شام ہی کا کیوں نہ ہو بڑی بات تھی۔ اب تو ماموں بھی برسرِ روزگار تھے لیکن ابا مرحوم نے کبھی بھی معاشی مسائل کی آڑ میں ان سے کوئی توقع نہ باندھی۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی معاشی مسائل پر نرم گرم نہ دیکھا وہ کئی برس ہمارے ساتھ رہے لیکن والدین نے ان سے گھریلو اخراجات کی مد میں ایک پیسہ بھی نہ لیا اور نہ ہی کبھی ماموں جان نے ہی ایسی ضرورت محسوس کی۔

1970 کی ابتدا میں وہ شادی کرنے کے بعد ہمارے گھر کو خیر باد کہہ گئے تو اب میرے مضمون بھی چھپنا بند ہو گئے اس لیے کہ نہ مجھے اخباری دفاتر کا پتہ تھا اور نہ کوئی اس سلسلے میں میرا مددگار تھا۔ (جاری ہے)

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا

"ماہنامہ 'اطراف' کو فخر ہے کہ امریکہ میں شائع ہونے والی انتہائی اہم تصنیف The Post American World کا سلسلہ وار ترجمہ شائع کر رہا ہے۔ فرید ذکریا امریکہ کے انتہائی اہم اینکر پرسن ہیں۔ تدبر سے کام لیتے ہیں۔ عالمی سیاست۔ معیشت اور ثقافت پر نظر رکھتے ہیں۔ تاریخ جغرافیہ۔ اور اقتصادیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کا تجزیہ ہمیشہ معروضی ہوتا ہے۔ ان کی اکثر پیشگوئیاں درست ثابت ہوتی رہی ہیں۔"

چینی جہاز کو 1851 میں نمائش کے لیے جانے میں 300 سال لگے

تحریر: فرید ذکریا تلخیص و ترجمہ: سید عرفان علی یوسف

قسط نمبر 6

ایک غیر مغربی دنیا؟

1492 میں کرسٹوفر کولمبس نے انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ اہم مہموں میں سے ایک مہم پر سفر کیا جس کے نتیجے میں امریکی دریافت ہوا۔ جو بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس سے ستاسی سال پہلے ژینگ ہی نامی ایک چینی امیر البحر نے سات یکساں اہم مہمات میں سے پہلی مہم شروع کی تھی۔ ژینگ کے بحری جہاز کولمبس، واسکوڈی گاما، یا یورپ کے پندرہویں اور سولہویں صدی کے دیگر عظیم سمندری جہازوں سے بہت زیادہ بڑے اور زیادہ بہتر تھے۔ اپنے پہلے سفر میں جو 1405 میں شروع ہوا، چینی امیر البحر کے بحری بیڑے میں کولمبس کی 4 کشتیوں اور 150 ملاحوں کے مقابلے میں 317 بحری جہاز اور 28,000 ملاح تھے۔ چینی بحری بیڑے کے بحری جہاز، چار سو فٹ سے زیادہ لمبے تھے۔ یعنی کولمبس کے پرچم بردار سانتا ماریا سے چار گنا زیادہ بڑے تھے اور ان کے نو مستول تھے۔ ہر جہاز کی تعمیر میں اتنی لکڑی استعمال ہوئی تھی کہ تین سو ایکڑ کا جنگل کاٹ دیا گیا تھا۔ یہ بحری جہاز گھوڑوں، سامان، خوراک، پانی، اور بلاشبہ فوجیوں کو لے جانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ ژینگ کے فلوٹیلا میں شامل سب سے چھوٹا جہاز بھی کولمبس کے افسانوی ہسپانوی گیلین سے دوگنا بڑا تھا۔

چینی بحری جہاز خصوصی لکڑیوں، پیچیدہ جوڑوں، جدید ترین واٹر پروفنگ تکنیکوں اور ایک ایڈجسٹ سنٹر بورڈ کیل کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔ خزانے کے بحری جہازوں میں بڑے، پرتعیش کیبن، سلک سیل اور کھڑکی والے ہال تھے۔ یہ سب نانجنگ میں خشک گودیوں پر بنے تھے، جو اب بھی دنیا کی سب سے بڑی اور جدید ترین جہاز سازی کی بندرگاہ ہے۔ 1405 کے بعد کے تین سالوں میں، نانجنگ میں 1,681 بحری جہاز بنائے گئے یا ان کی مرمت کی گئی۔ اس وقت یورپ جہاز رانی اور جہاز سازی میں چین سے بہت پیچھے تھا۔ بحری جہازوں میں سب سے زیادہ سائز اہمیت رکھتا ہے۔ ان بڑے بحری بیڑوں کا مقصد امریکہ کے قدیم باشندوں کو "حیران اور خوفزدہ" کرنا تھا۔ چینی بحری بیڑے سے منگ خاندان کی طاقت اور وسعت ظاہر ہوتی تھی۔

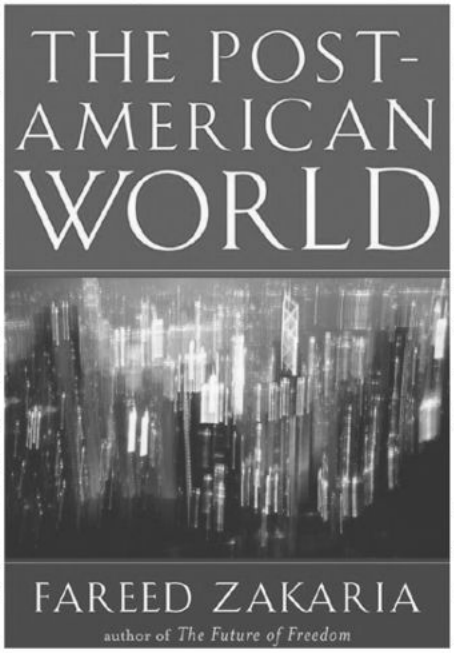

1405 اور 1433 کے درمیان اپنی سات مہموں کے دوران ژینگ نے بحر ہند کے پانیوں اور جنوب مشرقی ایشیا کے گرد وسیع پیمانے پر سفر کیا۔ چینی امیر البحر نے مقامی لوگوں کو تحائف دیے اور خراج تحسین قبول کیا۔ جب بھی مزاحمت کا سامنا ہوا تو انہوں نے فوجی طاقت کے استعمال میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ایک سفر پر، چینی امیر البحر نے سماٹران کے ایک بحری قزاق کو شکست دی۔ دوسری مرتبہ، سیلون کے ایک باغی سردار کو شکست دی۔ ان سب کے پھولوں، پھلوں، قیمتی پتھروں اور غیر ملکی جانوروں کو ضبط کر لیا جن میں شاہی چڑیا گھر کے لیے زرافے اور زیبرے بھی شامل تھے۔

لیکن زینگ کی کہانی عجیب طور پر ختم ہوتی ہے۔ 1430 کی دہائی میں، ایک نیا شہنشاہ اقتدار میں آیا۔ اس نے اچانک شاہی مہمات کو ختم کر کے تجارت اور تلاش کی مہمات سے منہ موڑ لیا۔ کچھ چینی عہدیداروں نے مہم جوئی کی روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ 1500 میں، ایک چینی عدالت نے حکم دیا کہ جو بھی جہاز دو مستولوں سے زیادہ (سمندر میں کسی بھی فاصلے پر جانے کے لیے درکار سائز) کے ساتھ بنائے گا اسے پھانسی دی جائے گی۔ 1525 میں، ساحلی حکام کو حکم دیا گیا کہ وہ سمندر میں چلنے والے کسی بھی جہاز کو تباہ کر دیں اور مالکان کو جیل میں ڈال دیں۔ 1551 میں کسی بھی مقصد کے لیے ملٹی ماسٹ جہاز پر سمندر میں جانا جرم بن گیا۔ جب چنگ خاندان 1644 میں برسر اقتدار آیا تو اس نے اس بنیادی پالیسی کو جاری رکھا، لیکن اس کا فرمانوں پر کم اعتماد تھا۔

چین کے جنوبی ساحل کی 700 میل لمبی جنوبی پٹی، اسے ناقابل رہائش بناتی ہے۔ ان اقدامات کا مطلوبہ اثر ہوا: چین کی شپنگ انڈسٹری تباہ ہو گئی۔ ژینگ کے آخری سفر کے بعد کی دہائیوں میں، درجنوں مغربی مم جوؤں نے ہندوستان اور چین کے آس پاس کے پانیوں کا سفر کیا۔ لیکن ایک چینی جہاز کو 1851 کی عظیم نمائش کے لیے لندن کے دورے پر یورپ جانے میں تین سو سال لگے۔

اس قابل ذکر تبدیلی سے کیا وضاحت ہوتی ہے؟ چینی اشرافیہ ظاہری نقطہ نظر پر تقسیم تھی، اور بیجنگ کے نئے حکمرانوں نے بحری مہمات کی ناکامیوں کو سمجھا۔ یہ مہمات بہت مہنگی تھیں۔ چینی بادشاہ پہلے سے

غربت اور تنگی کا شکار آبادی پر بہت زیادہ ٹیکس لگاتے تھے، اور عوام کا بہت کم خیال رکھتے تھے۔ کچھ رابطوں کے نتیجے میں تجارت کو فروغ ملا لیکن اس کا زیادہ تر فائدہ صرف تاجروں اور بحری قزاقوں کو ہوا۔ اس کے علاوہ، پندرہویں صدی کے وسط تک، منگول اور دوسرے حملہ آور چینی سلطنت کو دھمکیاں دے رہے تھے، اور مسلسل حملے کر رہے تھے جس سے قومی وسائل برباد ہو رہے تھے۔ چینیوں کے لیے سمندری سفر ایک مہنگا خلفشار تھا۔

یہ قسمت کا فیصلہ تھا۔ چین نے بیرونی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا انتخاب کیا، دوسری طرف یورپ دنیا بھر میں قدم بڑھا رہا تھا۔ یہ یورپ کی بحری مہمات تھیں جنہوں نے اسے خود کو متحرک کرنے اور پوری دنیا میں اپنی طاقت اور اثر و رسوخ پھیلانے کا موقع دیا۔ اگر چین اپنی بحریہ کو رواں دواں رکھتا تو جدید تاریخ کا دھارا مختلف ہوتا؟ چین کا اندر کی طرف رخ کرنے کا فیصلہ بری حکمت عملی نہیں تھی۔ یہ ایک تہذیب کے جمود کا اظہار تھا۔ مہمات کو ختم کرنے کے فیصلے کے پیچھے اسباب کا پورا سلسلہ چھپا ہوا تھا کہ کیوں چین زیادہ تر غیر مغربی دنیا سے پیچھے رہ گیا؟

پندرہویں صدی کے بعد سینکڑوں سالوں تک یورپ اور امریکہ صنعتی، شہری اور جدید ترقی سے ہم کنار ہوتے رہے، باقی دنیا غریب اور زرعی رہی۔ جبکہ مغرب کا فکری اور مادی غلبہ ہو گیا۔ ہم نصف ہزار سال سے ایک مغربی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ دوسری قوموں اور براعظموں کے عروج کے باوجود مغرب کے سائے لمبے ہیں اور آنے والی دہائیوں تک اس کی وراثتیں گہری ہیں اور شاید طویل بھی۔ یہ کہنا عام ہے کہ دراصل چین اور ہندوستان 1800 کی دہائی تک مغرب سے زیادہ امیر تھے۔ مغرب کا غلبہ 200 سال تک رکا رہا اور اب ہم معمول کے توازن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب کی ترقی بڑی حد تک حادثاتی ہو سکتی ہے یعنی " کوئلہ اور کالونیوں، " کا نتیجہ، توانائی کے سستے ذرائع کی دریافت اور ایشیا، افریقہ اور امریکہ کی امیر زمینوں پر تسلط۔ یہ نظریہ، جو ایک کثیر الثقافتی حساسیت کو ظاہر کرتا ہے، مغرب کی کسی خاص حیثیت سے انکار کرتا ہے، اس کے سیاسی فوائد ہیں۔ اگرچہ یہ سیاسی طور پر درست ہو سکتا ہے، لیکن یہ تاریخی طور پر غلط ہے۔ اس غلط تشریح کی ایک وجہ یہ ہے کہ تجزیہ کار اکثر چینی اور ہندوستانی معیشتوں کے مجموعی حجم پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر، یہ گمراہ کن اعداد و شمار ہیں۔ جدید دور تک، کسی ملک کی معیشت کو متحرک، یا کسی معنی خیز معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سترھویں صدی میں، چین کے دور دراز اور غیر منسلک کونوں میں لاکھوں کسان غربت میں زمین پر کام کر رہے تھے اور انہوں نے قوم کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

قابل استعمال دولت یا طاقت، اگرچہ پیداوار میں اضافہ کا سبب تھی۔ آبادی جی ڈی پی کا بنیادی جزو اور پیداوار زیادہ تر زرعی تھی۔ چونکہ 1600 میں چین اور ہندوستان کی آبادی مغربی یورپ کا چار گنا تھی، اس لیے ان کی مجموعی قومی پیداوار (جی ڈی پی) یقیناً زیادہ تھی۔ 1913 میں، جب برطانیہ دنیا کی سرکردہ طاقت تھا، جدید ٹیکنالوجی، صنعتی پیداوار اور تجارت تمام ایشیا سے کئی گنا زیادہ تھی جبکہ چین مجموعی جی ڈی پی زیادہ ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ صنعت سے پہلے کے دور کا مطالعہ کرتے ہوئے، بڑی حکومت، مواصلات، نقل و حمل اور وسیع پیمانے پر ٹیکس لگانے سے پہلے، مجموعی جی ڈی پی قومی طاقت یا ملک کی ترقی کی سطح کے بارے میں بہت کم بتاتی ہے۔ یہ معاشرے کی حرکیات یا نئی دریافتوں اور ایجادات کرنے کی صلاحیت کے بارے میں کچھ نہیں کہتی۔ یہ ان علاقوں میں مہارت تھی جس نے ایک ملک کو دولت اور اس کی حکومتی طاقت بنانے کے طریقے یا راستے فراہم کیے۔

اگر ہم اقتصادی ترقی اور فی کس جی ڈی پی پر غور کریں تو ہمیں ان ممالک کی حقیقی حیثیت کی واضح تصویر ملتی ہے۔ مغربی یورپ کا جی ڈی پی فی کس 1500 تک چین اور ہندوستان دونوں سے زیادہ تھا۔ 1600 تک، یہ چین کے مقابلے میں 50 فیصد زیادہ تھا۔ وہاں سے یہ فاصلے بڑھتے ہی چلے گئے۔ 1350 سے 1950 تک (6 سو سال کے درمیان) چین اور ہندوستان میں فی کس جی ڈی پی تقریباً مستحکم رہی (چین کے لیے تقریباً 600 ڈالر اور ہندوستان کے لیے 550 ڈالر۔ اسی عرصے میں، مغربی یورپ کی جی ڈی پی فی کس $662 سے 4,594 ڈالر ہو گئی، جو 594 فیصد اضافہ تھا۔ سترہویں صدی میں یورپی سیاح معمول کے مطابق نشاندہی کرتے تھے کہ چینی اور ہندوستانی زندگی کے حالات شمال مغربی یورپ کے حالات سے بہت کم ہیں۔ ماہر معاشیات گری کلارک کا حساب ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایمسٹرڈم میں ایک مزدور کی اوسط یومیہ اجرت سے 21 پاؤنڈ گندم خریدی جا سکتی تھی، لندن میں 16 پاؤنڈ اور پیرس میں 10۔ چین میں، ایک دن کی اجرت سے تقریباً 6.6 پاؤنڈ گندم خریدی جاتی تھی۔ گندم (یا اس کے مساوی) کلارک نے قحط میں فرق کا تعین کرنے کے لیے ریکارڈز کا بھی جائزہ لیا، جو ایک ہی سمت کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ مغرب اٹھارویں صدی سے بہت پہلے مشرق سے زیادہ خوشحال تھا۔

پھر بھی، یہ ہمیشہ اس طرح نہیں تھا. دوسرے ہزاریے کی پہلی صدیوں تک، مشرق تقریباً ہر لحاظ سے مغرب سے آگے تھا۔ جیسے جیسے یورپ نے قرون وسطیٰ کی گہرائیوں میں ترقی کی بنیاد رکھی، اسکالرشپ، ایجاد اور تجارت کی زندہ روایات کے ساتھ مشرق وسطیٰ اور ایشیا دونوں نے ترقی کی۔ مسلم مشرق وسطیٰ تہذیب میں سب سے آگے تھا۔

چین بیرونی دنیا سے کنارہ کش ہوا تو یورپ نے بحری مہمات شروع کر دیں

یونانی اور رومی علم کو محفوظ کرنے اور اس پر نئے علوم کی تعمیر اور ریاضی، طبیعیات، طب، بشریات، اور نفسیات جیسے متنوع شعبوں میں بھی مسلم مشرق وسطیٰ آگے تھا۔ عربی ہندسے، یقیناً مسلم مشرق وسطیٰ میں ایجاد ہوئے، صفر کا تصور دیا۔ "الجبرا" کا لفظ ایک عرب عالم کی کتاب الجبر والمقابلہ کے عنوان سے آیا۔ لفظ "الگورتھم" مسلمان عالم الخوارزمی سے ماخوذ ہے۔ عسکری طور پر، عثمانی اپنے حریفوں پر غالب تھے اور سترھویں صدی تک وسطی ایشیا اور یورپ میں مغربی ریاستوں سے لڑتے ہوئے اپنی سلطنت کو وسعت دیتے رہے۔ ہندوستان، اپنے سب سے زیادہ متحرک ادوار کے دوران، سائنسی صلاحیت، فنکارانہ ذہانت، اور تعمیراتی شان و شوکت پر فخر کرتا ہے۔ سولہویں صدی کے اوائل میں بھی، کرشنا دیورایا کے دور میں، جنوبی ہندوستان کے شہر وجے نگر کو بہت سے غیر ملکی سیاحوں نے دنیا کے عظیم شہروں میں سے ایک قرار دیا اور وہ اس کا موازنہ روم سے کرتے تھے۔ چند صدیاں پہلے چین شاید کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ امیر اور تکنیکی لحاظ سے نفیس تھا اور مختلف ٹیکنالوجیز کا استعمال کر رہا تھا۔ وہ بارود، اور موویبل ٹائپ کی ٹیکنالوجی پر جسے مغرب نے چند صدیوں بعد ٹھوکر ماری، عبور حاصل کر چکا تھا ۔ یہاں تک کہ افریقہ کی اوسط آمدنی بھی یورپ سے زیادہ تھی۔

پندرہویں صدی میں مدوجزر کا رخ مڑنا شروع ہوا اور سولہویں صدی تک یورپ آگے بڑھ چکا تھا۔ فکر میں انقلاب کے ساتھ جسے نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے، کوپرنیکس، ویسالیئس اور گلیلیو نے جدید سائنس کو جنم دیا۔ درحقیقت، 1450 اور 1550 کے درمیان سو سال انسانی تاریخ میں سب سے اہم وقفے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک طرف کی قومیں رسوم اور عقیدہ کے درمیان الجھی ہوئی تھیں، اور دوسری طرف مشاہدہ، تجربہ اور تنقیدی فکر انگڑائی لے کر ترقی کے نئے باب کھول رہی تھی۔ یہ انقلاب یورپ میں برپا ہوا، اور اس نے اس نئی تہذیب کو صدیوں تک آگے بڑھا دیا۔ 1593 تک، جب ستاسی توپوں سے لیس ایک انگریز جہاز 3700 میل کا سفر طے کر کے استنبول پہنچا، تو

ایک عثمانی مورخ نے اسے "عمر کا ایسا عجوبہ کہا کہ جس کی مثال اس سے پہلے نہ دیکھی گئی تھی اور نہ ہی ریکارڈ کی گئی۔" سترھویں صدی تک تقریباً ہر قسم کی ٹیکنالوجی، مصنوعات، اور پیچیدہ تنظیم (جیسے کارپوریشن یا فوج) مغربی یورپ میں دنیا کی کسی بھی جگہ سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ یہ ماننا کہ ایشیائی معاشرے کسی بھی مادی لحاظ سے 1700 یا 1800 میں مغرب کے مساوی تھے مضحکہ خیز ہے۔ یہ ماننا کہ پچھلے تین سو سالوں میں مغربی دنیا میں جو سائنسی اور تکنیکی ترقی ہوئی، اس کا اس کی مادی حالت پر کوئی اثر نہیں پڑا مضحکہ خیز ہے۔

یہ ترقی صرف نئی مشینیں بنانے کے بارے میں نہیں تھی۔ مغربی معاشروں کی ذہنی سوچ کو نئی شکل ملی۔ مکینیکل گھڑی کو لے لیجئے، جو تیرہویں صدی میں یورپ میں ایجاد ہوئی تھی۔ مورخ ڈینیل بورسٹن اسے "مشینوں کی ماں" کہتا ہے۔ اس نے نوٹ کیا کہ "گھڑی نے علم، چالاکی اور مہارت کے درمیان دیواروں کو توڑ دیا، اور گھڑی بنانے والے شعوری طور پر میکانکس اور فزکس کے نظریات کو مشینوں کے بنانے پر لاگو کرنے والے تھے۔ اس کے دیگر وسیع تر اثرات بھی تھے۔ زیادہ انقلابی گھڑی نے انسان کو سورج اور چاند پر انحصار سے آزاد کر دیا۔ اس نے دن کو ترتیب دینا، رات کو متعین کرنا، کام کو منظم کرنا، اور شاید سب سے اہم، مزدوری کی لاگت کی پیائش کرنا، کسی پروجیکٹ میں گزرنے والے گھنٹوں کی تعداد کا پتہ لگا کر ترقی کو ممکن بنایا۔ گھڑی سے پہلے وقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

دوسرے ہزاریے کی پہلی صدیوں تک مشرق ہر لحاظ سے مغرب سے آگے تھا

سولہویں صدی تک، جب پرتگالی یورپی گھڑیاں چین لائے، یورپ کی مشینی گھڑیاں بیجنگ میں بنی پانی کی گھڑیوں سے کہیں زیادہ نفیس تھیں۔ چینیوں نے ان مشینوں کی قدر کم دیکھی، انہیں کھلونوں کے طور پر زیادہ دیکھا۔ انہوں نے ان گھڑیوں کو چلانے کا طریقہ سیکھنے کی کبھی زحمت نہیں کی۔ اسی طرح، جب پرتگالی سو سال بعد بیجنگ میں توپیں لائے تو ان مشینوں کے لیے آپریٹرز کی فراہمی کرنی پڑی۔ چین جدید ٹیکنالوجی استعمال کر سکتا تھا، لیکن وہ اسے پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اٹھارویں صدی تک، بیجنگ غیر ملکی گیجٹس دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جارج سوم کے نام ایک مشہور خط میں، 1736 سے 1795 تک حکمرانی کرنے والے کیئن لونگ شہنشاہ نے تجارت کے لیے برطانیہ کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے وضاحت کی: "ہم نے کبھی بھی عجیب و غریب اور ذہین چیزوں کا زیادہ ذخیرہ نہیں کیا، اور نہ ہی ہمیں آپ کے ملک کی مزید مصنوعات کی ضرورت ہے۔" چینیوں نے دنیا بھر میں ہونے والی ترقی پر اپنا دماغ بند کر رکھا تھا۔

مغرب کے آگے بڑھنے پر غیر مغربی ممالک کیوں خاموش رہے

نئی ٹیکنالوجیز اور تکنیکوں کے بغیر، ایشیا کلاسک مالتھوسیائی مسئلے کا شکار ہو گیا۔ تھامس مالتھوس کا 1798 کا مشہور مقالہ، آبادی کے اصول پر ایک مضمون، آج اس کی غلط مایوسی کے لیے یاد کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت مالتھوس کی بہت سی بصیرتیں انتہائی ذہانت تھیں۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ انگلینڈ میں خوراک کی پیداوار ریاضی کی شرح سے بڑھی ہے (1, 2, 3, 4,..) لیکن آبادی میں ہندسی شرح (1, 2, 4, 8, 16,..) سے اضافہ ہوا ہے۔ یہ مماثلت، جب تک کہ تبدیل نہ کیا جائے، اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ملک بھوکا اور غریب ہو جائے گا، اور یہ کہ صرف قحط اور بیماری جیسی تباہی ہی آبادی کو سکیڑ کر معیار زندگی کو بلند کر سکتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی طاقت کیا ہے؟. اس نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ یہی دباؤ یورپ میں زرعی انقلاب کے لیے انسانی ردعمل پیدا کرے گا، جس نے خوراک کی پیداوار کو وسیع پیمانے پر بڑھایا۔ (براعظم یورپ نے لاکھوں لوگوں کو مختلف کالونیوں، زیادہ تر امریکہ میں برآمد کر کے اپنی آبادی کے دباؤ کو بھی کم کیا۔) لہذا مالتھوس یورپ کے بارے میں غلط تھا۔ لیکن اس کے تجزیہ نے ایشیا اور افریقہ کے حالات کو اچھی طرح سے بیان کر دیا۔

طاقت کمزور ہی ہے

ان غیر معمولی چینی سفروں کو کیسے سمجھا جائے؟ ژینگ کا شاندار بحری بیڑہ چین اور ہندوستان میں نمایاں کامیابیوں کی ایک بڑی تصویر کا صرف ایک حصہ ہے۔ ہندوستان میں محلات، اور شہری عمارتیں عین اس وقت تعمیر کی جا رہی تھیں جب مغرب نئے براعظموں کی تلاش میں آگے بڑھ رہا تھا۔ تاج محل 1631 میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کی پیاری بیوی ممتاز محل کے اعزاز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ایک برطانوی سیاح، ولیم ہوجز، ان بہت سے لوگوں میں سے ایک تھا جس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ یورپ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے لکھا، "بہت عمدہ مواد، خوبصورت شکلیں، اور مجموعی طور پر ہم آہنگی، میں نے جو کچھ بھی دیکھا اس سے کہیں زیادہ ہے۔" تاج محل کی تعمیر میں بے پناہ ہنر اور مہارت کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ کے حیران کن کارنامے بھی شامل تھے۔ کوئی معاشرہ دنیا کے ایسے عجائبات کیسے پیدا کر سکتا ہے اور پھر بھی وسیع پیمانے پر آگے نہ بڑھ سکے؟ اگر چین ایسی شاندار اور جدید ترین بحری مہمات کر سکتا ہے تو وہ گھڑیاں کیوں نہیں بنا سکتا؟

اس جواب کا ایک حصہ مغلوں کے تاج محل کی تعمیر میں ہے۔ بیس سال تک بیس ہزار مزدوروں نے سائٹ پر رات دن کام کیا۔ انہوں نے مواد کو 187 فٹ اونچے گنبد تک لے جانے کے لیے دس میل لمبا ریمپ بنایا۔ بجٹ لامحدود تھا، اور اس منصوبے میں ڈالے جانے والے اوقات کار پر کوئی قدغن نہیں رکھی گئی۔ چینی امیر البحر ژینگ ہی کا فلوٹیلا یا بحری بیڑہ اسی طرح کے کمانڈ سسٹم کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔ بیجنگ کا ممنوعہ شہر 1406 میں شروع ہوا، اس شہر کو ان کی نگرانی کے لیے دس لاکھ آدمیوں کی محنت اور مزید کئی لاکھوں سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ اگر ایک بڑے معاشرے کی تمام تر توانائیاں اور وسائل چند منصوبوں پر لگ جاتے ہیں، تو وہ منصوبے اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں- لیکن یہ الگ تھلگ کامیابیاں ہوتی ہیں جن کا معاشرے پر اجتماعی اثر نہیں پڑتا۔ سوویت یونین نے 1970 کی دہائی میں ایک غیر معمولی خلائی پروگرام پر خوب فخر کا اظہار کیا، حالانکہ اس وقت تک وہ تکنیکی طور پر تمام صنعتی ممالک میں سب سے زیادہ پسماندہ تھا۔ لیکن کسی مسئلے پر زیادہ افرادی قوت ضائع کرنا اختراع کا راستہ نہیں ہے۔ تاریخ دان فلپ ہوانگ نے یانگزی ڈیلٹا کے کسانوں اور انگلینڈ کے کسانوں، چین اور یورپ کے امیر ترین خطوں کے درمیان بالترتیب 1800 میں ایک دلچسپ موازنہ کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ، کچھ اقدامات سے، ایسا لگتا ہے کہ دونوں علاقے برابر اقتصادی سطح پر تھے لیکن درحقیقت برطانیہ لیبر کی پیداواری ترقی کی کلیدی پیائش میں بہت آگے تھا۔ چینی اپنی زمین کو بہت زیادہ پیداواری بنانے کے قابل تھے، لیکن انہوں نے ایک مقررہ ایکڑ پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام کرنے کے لیے لگا کر ایسا کیا کہ جسے ہوانگ نے کہا "ترقی کے بغیر پیداوار۔" دوسری طرف انگریز محنت کو زیادہ پیداواری بنانے کے طریقے تلاش کرتے رہے، تاکہ ہر کسان زیادہ فصلیں پیدا کرے۔ انہوں نے جانوروں کو استعمال کرتے ہوئے اور مشینیں ایجاد کرتے ہوئے مزدوری بچانے کے نئے آلات دریافت کیے۔ جب ملٹی اسپنڈل وہیل، جس کے لیے ایک تربیت یافتہ

آپریٹر کی ضرورت تھی، تیار کیا گیا تو اسے انگلینڈ میں بڑے پیمانے پر ڈھال لیا گیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں چین میں، کمتر لیکن سستا واحد ٹکلا برقرار رہا، کیونکہ اسے بہت سے غیر تربیت یافتہ آپریٹرز استعمال کر سکتے تھے۔ (چونکہ محنت کی قدر کم تھی، اس لیے مزدوری بچانے والی مشینوں پر پیسہ کیوں خرچ کیا جاتا؟) نتیجہ یہ نکلا کہ برطانویوں کی ایک چھوٹی سی تعداد بہت بڑی زمین کاشت کرنے کے قابل ہوگئی۔ اٹھارویں صدی تک، جنوبی انگلینڈ میں فارم کا اوسط سائز 150 ایکڑ تھا۔ چین کے یانگسی ڈیلٹا میں، یہ تقریباً ایک ایکڑ تھا۔

بحری مہمات مشرقی اور مغربی نقطہ نظر میں فرق کو بھی واضح کرتی ہیں۔ یورپی مشن کم شاندار لیکن زیادہ نتیجہ خیز تھے۔ وہ اکثر مکمل طور پر پرائیویٹ یا پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ تھے اور دوروں کی ادائیگی کے لیے نئے طریقے استعمال کرتے تھے۔ ڈچوں نے فنانس اور ٹیکسیشن میں اختراعات کا آغاز کیا۔ ان کے ہیرنگ کے تاجر 1580 کی دہائی تک مستقبل کے معاہدوں کو بڑے پیمانے پر استعمال کر رہے تھے اور ان کے مالیاتی میکانزم نے ایک اہم پیش رفت کی نشان دہی کی۔ انہوں نے بحری مہمات کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے فنڈنگ کو یقینی بنایا۔ ہر سفر کا مقصد منافع کمانا، نئی دریافت کرنا اور نئی مصنوعات تلاش کرنا تھا۔ پراجیکٹ آزمائش اور غلطی سے آگے بڑھے۔ چین میں، اس کے برعکس، سفر کا انحصار ایک بادشاہ کے مفادات اور طاقت پر تھا۔ جب بادشاہ چلا گیا تو سفر رک گئے۔ ایک نئے شہنشاہ نے جہازوں کو تباہ کرنے کا حکم بھی دیا، اس لیے چینیوں کی تعمیر کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ چینیوں نے تیرھویں صدی میں توپوں کا موثر استعمال کیا لیکن تین سو سال بعد، وہ کسی یورپی ماہر کے بغیر کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہارورڈ کے معاشی مورخ ڈیوڈ لینڈز نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چین "سائنسی اور تکنیکی ترقی کا ایک مسلسل، خود کو برقرار رکھنے والا عمل پیدا کرنے میں ناکام رہا۔" چین کی کامیابیاں واقعاتی اور وقتی طور پر ختم ہوئیں۔ یہ ایشیا کا المیہ تھا: جب ان کے پاس علم تھا تب بھی وہ علم بے مصرف تھا۔ دوسرے الفاظ میں علم نہیں تھا:

کیا ثقافت تقدیر ہے؟

مغرب کے آگے بڑھنے کے باوجود غیر مغربی ممالک خاموش کیوں رہے؟ یہ سوالات صدیوں سے زیر بحث رہے ہیں، اور اس کا کوئی صاف جواب نہیں ہے۔ نجی املاک کے حقوق، حکمرانی کے اچھے ادارے، اور ایک مضبوط سول سوسائٹی (یعنی جس پر ریاست کا غلبہ نہ ہو) واضح طور پر یورپ اور بعد میں، امریکہ میں ترقی کے لیے اہم تھے۔ اس کے برعکس، روسی زار نظریاتی طور پر اپنے پورے ملک کا مالک تھا۔ چین میں، منگ بادشاہ کی عدالت کو مندارن (درباری) چلاتے تھے جو تجارت کو حقیر سمجھتے تھے۔ غیر مغربی دنیا میں تقریباً ہر جگہ سول سوسائٹی کمزور اور حکومت پر انحصار کرتی تھی۔ ہندوستان میں مقامی تاجر ہمیشہ دربار کی خواہشوں کے اسیر رہتے تھے۔ چین میں، امیر تاجر کنفیوشس کلاسیکی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنے کاروبار کو ترک کر دیتے تاکہ وہ دربار کے پسندیدہ بن سکیں۔

مغل اور عثمانی جنگجو اور اشرافیہ تھے جو تجارت کو غیر مہذب اور غیر اہم سمجھتے تھے (حالانکہ مشرق وسطیٰ میں ایک طویل تجارتی روایت تھی)۔ ہندوستان میں، اس تعصب کو ہندو ذات کے درجہ بندی میں تاجروں کی پست پوزیشن سے تقویت ملی۔ مورخین نے ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کے طور پر ہندو عقائد اور طریقوں کو خاص طور پر نوٹ کیا۔ پال کنیڈی کا استدلال ہے، "ہندو مذہبی ممنوعات نے جدیدیت کے خلاف جنگ لڑی: ہندوؤں کے مذہبی عقائد میں چوہے اور کیڑے مکوڑے نہیں مارے جا سکتے تھے، اس لیے کھانے کی بڑی مقدار ضائع ہوگئی؛ کچرے کو سنبھالنے کے بارے میں سماجی رویوں نے مستقل طور پر پاگل پن کے حالات پیدا کیے، جو بوبونک کی افزائش گاہ بنے۔ ذات پات کے نظام نے طاعون کو پھیلایا۔

اگر ثقافت ہی سب کچھ ہے تو چین اور ہندوستان کا احتساب کیسے کریں؟ آج، ان کی غیر معمولی نشوونما کو اکثر ان کی مخصوص ثقافتوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ کنفیوشس ازم کبھی ترقی کے لیے برا تھا، اب یہ اچھا ہے۔ ہندو ذہنیت، جو کبھی ایک رکاوٹ تھی، اب ایک قسم کی عملی دنیاداری کو مجسم کرتی نظر آتی ہے جو کاروباری سرمایہ داری کو زیر کرتی ہے۔ چینی اور ہندو ڈایسپورا کی کامیابی بظاہر اس طرح کے نظریات کی روزانہ تصدیق فراہم کرتی ہے۔

سیاست نہیں ثقافت معاشرے کو کامیاب بناتی ہیں

امریکہ کے معروف اسکالر سینیئر آنجہانی ڈینیل پیٹرک موئنی ہن نے ایک بار کہا تھا، "مرکزی قدامت پسند سچائی یہ ہے کہ یہ ثقافت ہے، سیاست نہیں، جو معاشرے کی کامیابی کا تعین کرتی ہے۔ مرکزی لبرل سچائی یہ ہے کہ سیاست کسی ثقافت کو بدل سکتی ہے اور اسے بچا سکتی ہے۔ ثقافت اہم ہے، بہت اہم ہے۔ لیکن یہ بدل سکتی ہے۔ ثقافتیں پیچیدہ ہیں۔ کسی بھی لمحے، بعض اوصاف نمایاں ہوتے ہیں اور ناقابل تغیر معلوم ہوتے ہیں اور پھر سیاست اور معاشیات میں تبدیلی آتی ہے، اور وہ صفات اہمیت میں کمی لاتی ہیں، دوسروں کے لیے جگہ بناتی ہیں۔ عرب دنیا کبھی سائنس اور تجارت کا مرکز تھی۔ حالیہ دہائیوں میں اس کی اہم برآمدات تیل اور اسلامی بنیاد پرستی رہی ہے۔ کسی بھی ثقافتی دلیل کو کامیابی کے ادوار اور ناکامی کے ادوار دونوں کی وضاحت کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

اب زیادہ نمایاں ایشیائی کمرشلزم صدیوں سے دفن کیوں تھا

ایشیائی کمرشل ازم اب اتنا نمایاں ہے لیکن صدیوں سے دفن کیوں تھا؟ ایشیا کے زیادہ تر ممالک میں طاقتور اور مرکزی ریاستیں تھیں جو اپنی رعایا سے ٹیکس وصول کرتی تھیں اور بدلے میں کچھ نہیں دیتی تھیں۔ پندرہویں صدی سے لے کر انیسویں تک، ایشیائی حکمران بڑی حد تک ظلم کے دقیانوسی تصورات کے مطابق تھے۔ پندرہویں صدی میں مغلوں کے شمال سے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد، ان کی ظالمانہ حکمرانی بنیادی ڈھانچے، مواصلات، تجارت اور دریافت کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹیکسوں اور خراج کا مطالبہ کرنے اور محلات اور قلعے بنانے پر مشتمل تھی۔ جنوبی ہندوستان میں ہندو شہزادے زیادہ بہتر نہیں تھے۔ تاجروں کو اپنے حکمرانوں کی طرف سے متواتر اور من مانی ٹیکس لگانے کے پیش نظر شرح سود کو بلند رکھنا پڑا۔ کسی کو بھی دولت بنانے کے لیے زیادہ ترغیب نہیں تھی، کیونکہ اس کے ضبط کیے جانے کا امکان تھا۔ مشرق وسطیٰ میں مرکزیت بہت بعد میں آئی۔ جب اس خطے پر عثمانی سلطنت کے تحت نسبتاً سست انداز میں حکومت کی گئی اور تجارت اور جدت طرازی پروان چڑھی۔ سامان، خیالات، اور ہر جگہ کے لوگ آزادانہ طور پر گھل مل گئے۔ لیکن بیسویں صدی میں "جدید" اور طاقتور قومی ریاستیں بنانے کی کوشش کے نتیجے میں آمریتیں وجود میں آئیں جس نے معاشی اور سیاسی جمود کو جنم دیا۔ شہری تنظیمیں پسماندہ ہوگئیں۔ مضبوط ریاستوں اور کمزور معاشروں کے ساتھ، عرب دنیا ترقی کے تقریباً تمام پیمانے پر باقی دنیا سے پیچھے رہ گئی۔ (جاری ہے) ❁

عاصم متین خان بہت مصروف تھے۔ سفر میں نیویارک سے باہر۔ ہماری درخواست تھی کہ ان دنوں پاکستان کے قارئین نئی امریکی انتظامیہ کی پالیسیوں کے بارے میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے وقت نکالا اور ہمیں فوراً حالات حاضرہ سے آگاہ کیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

ٹرمپ امریکہ کو مطلق العنانیت کی طرف لے جا رہے ہیں

عاصم متین خان
امریکہ میں 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی

جیسا کہ امید تھی امریکی صدر ٹرمپ نے اپنے صدارتی عہدے کا حلف اٹھاتے ہی اپنے ایگزیکیوٹو آرڈرز پر دستخط کرنا شروع کر دیئے۔ ویسے تو ٹرمپ نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے پہلے ہی اپنی ٹیم تیار کر لی تھی جو امریکہ کے انتہائی سفید فام متعصب اور قوم پرستانہ خیالات رکھنے والے ٹرمپ کے وفاداروں پر مبنی تھی۔ اکثر تجزیہ نگار ٹرمپ اور ان کی انتظامیہ کو نازی جرمنی کے ہٹلر کی نئی شکل قرار دیتے ہیں اور اس کا عملی مظاہرہ ٹرمپ کے قریب ترین ساتھی ایلون مسک نے ٹرمپ حلف اٹھانے کے بعد ہونے والی ایک تقریب میں ہٹلر کی طرح نازیوں کے انداز میں سلیوٹ کیا۔ ان کی اس حرکت پر امریکہ میں بھی تنقید کی گئی اگرچہ اس کے لیے وضاحتیں کی گئیں لیکن یہ حرکت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی جس کا مقصد دنیا کو اشارہ دینا تھا۔

حسب وعدہ ٹرمپ کے حلف اٹھانے کے چند گھنٹوں کے بعد سے امریکہ کی مختلف ریاستوں میں امیگریشن حکام نے چھاپے مارنے شروع کر دیے اور پہلے ہفتے میں کئی ہزار غیر قانونی تارکین وطن کو گرفتار کر لیا گیا ان گرفتار شدگان کو مختلف جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ کولمبیا کے صدر نے کولمبیا سے گئے ہوئے تارکین وطن کو قبول کرنے سے اگرچہ انکار کر دیا تھا تاہم ٹرمپ کی دھمکی کے بعد کہ وہ کولمبیا کی درآمد پر 25٪ ٹیرف لگا دیں گے مجبوراً کولمبیا کے صدر کو ان تارکین وطن کی واپسی کو قبول کرنا پڑا۔ یہ ٹرمپ کی معاشی بدمعاشی کا پہلا مظاہرہ تھا۔ ویسے امریکہ میں غیر قانونی تارکین وطن کا آنے کا مسئلہ پچھلی چند دہائیوں میں شدت اختیار کر گیا ہے اس میں نہ صرف ساؤتھ امریکہ سے لاکھوں غیر قانونی تارکین وطن امریکہ میں داخل ہوتے ہیں لیکن بھارت بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے 2023ء کے اعداد و شمار کے مطابق 90 ہزار سے زائد بھارتیوں کو امریکہ میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا اور اس سے کئی گنا زیادہ لاکھوں بھارتی غیر قانونی طور پر نہ صرف امریکہ بلکہ کینیڈا میں بھی داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بھارتیوں کی ایک بڑی تعداد جو قانونی طور پر بھی امریکہ میں داخل ہوئی تھی وہ بھی اپنے ویزے کی میعاد ختم ہونے کے بعد امریکہ میں رکی ہوئی ہے۔ موجودہ صورتحال کے پیش نظر بھارت کی وزارت خارجہ نے امریکی حکام کو مطلع کر دیا ہے کہ وہ 18 ہزار ان غیر قانونی بھارتی تارکین وطن کو واپس لے لیں گے جن کا امریکہ سے بیدخلی کا کیس آخری مراحل میں ہے۔ آج تک تو امیگریشن حکام کے

ٹرمپ کی پالیسیوں سے امریکی پرائیویٹ ادارے بھی خوفزدہ

پاس نہ تو اتنا عملہ تھا اور نہ ہی اتنے معاشی وسائل تھے کہ وہ غیر قانونی تارکین وطن کے خلاف بڑا آپریشن شروع کرتے تاہم یہ کام ٹرمپ کی ترجیح ہے اور وہ امیگریشن حکام سمیت دیگر سرکاری ایجنسیوں کو بھی یہ اختیار دے رہے ہیں کہ وہ تارکین وطن کو روک کر ان کی امریکہ میں قانونی حیثیت کو چیک کر سکتے ہیں۔ ٹرمپ کے آنے سے پہلے میکسیکو اور امریکہ کی سرحد پر واقع شیلٹر جو ایک زمانے میں بھرے رہتے تھے آج خالی پڑے ہوئے ہیں۔

ٹرمپ اور ان کی ٹیم انتخابات جیتنے سے قبل ہی اتنے پر اعتماد تھے کہ انہوں نے اپنی بعد از انتخابات کی حکمت عملی تیار کر لی تھی۔ امریکہ کے مفادات کے لیے ٹرمپ انتظامیہ نے ان ہی بنیادوں پر طویل مدتی مربوط حکمت عملی تیار کی ہے جس کا مشورہ متعدد بار محمود شام اپنے کالموں میں اور شام اطراف میں پاکستان کی لیڈرشپ کو پاکستان کی ترقی کے لئے دے چکے ہیں۔ جس کا مقصد پاکستان کے ترقی کے اہداف مقرر کر کے اور پاکستان کے مفادات کا تعین کر کے 10 یا 15 یا 20 سال کے ایک روڈ میپ کی تیاری ہے۔ ٹرمپ اور ان کی انتظامیہ کا بھی یہی ارادہ ہے کہ "امریکہ کو دوبارہ عظیم تر بناؤ" کے کام کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھنا ہے اسی لیے طویل العمر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنی ٹیم میں زیادہ تر ایسے کم عمر لوگوں کو رکھا ہے جو ان کے ساتھ کام کر کے اس کام کو ان کے بعد بھی جاری رکھیں گے اور امریکہ کو دوبارہ ایک عظیم ملک بنائیں گے جو دنیا بھر میں بزور طاقت کنٹرول بھی حاصل کرے گا اور دوسرے ممالک کی رہنمائی بھی کرے گا لیکن اس کا حتمی گول امریکی مفادات کا دنیا بھر میں تحفظ ہوگا۔

جیسا کہ ٹرمپ پہلے کہتے رہے ہیں کہ وہ امریکہ کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے غیر ملکی درامدات پر 25 فیصد تک ٹیرف عائد کریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ کینیڈا اور میکسیکو سے آنے والی درآمد پر 25 فیصد جبکہ چین سے آنے والی درآمد پر اضافی 10 فیصد ٹیرف لگایا جائے گا۔ لیکن اس کے نتیجے میں امریکہ میں مہنگائی کا ایک طوفان اسکتا ہے ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ اس ٹیرف کی آمدنی کے آنے کے بعد دیکھیں گے انکم ٹیکس کی مد میں کمی کی جائے۔ امریکی کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کی قیمتیں پہلے ہی

بڑھادیں تاہم اور بعض کھانے پینے کی اشیاء کی کمپنیوں نے قیمت تو نہیں بڑھائی انہوں نے ڈبوں کے سائز چھوٹے کر دیئے ہیں جسکا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا۔ٹرمپ بنیادی طور پر ایک بزنسمین ہیں انہیں پتہ ہے کہ کس طرح سے اپنی مصنوعات کو مارکیٹ میں مقابلہ کر کے بیچنا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ان کی مزید پالیسیاں امریکی صارفین کو مہنگائی کے طوفان سے پریشان نہیں کریں گی۔

اپنے افتتاحی خطاب میں ٹرمپ نے وفاقی ایجنسیوں سے کہا تھا کہ وہ ایک Colorblind اور میرٹ پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے حائل تمام نظریات کو ختم کردیں۔ٹرمپ کے اس فیصلے سے امریکی خواتین اور سیاہ فام امریکی خاص طور پر پریشان ہیں۔ امریکہ میں کئی دہائیوں سے اس طرح کے قوانین موجود رہیں جو سیاہ فام اقلیت اور خواتین کو آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں اور اوباما کے بعد نہ صرف سرکاری اداروں میں بلکہ غیر سرکاری اداروں اور تعلیمی اداروں میں بھی اس طرح کی پالیسیوں کی باقاعدہ ترویج کی گئی جس کا مقصد ہر ادارے میں امریکہ میں آباد اکثریت اور اقلیت سب کی نمائندگی ہو اور سب کو یکساں ترقی کے مواقع میسر ہوں۔ٹرمپ کے اس اقدام کے بعد ان ملازمین کو بھی فارغ کیا جاسکتا ہے جو انہی قوانین کے تحت ملازمت کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔اسی سلسلے میں سرکاری ملازمین کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ان کو پتہ ہے کہ کوئی ملازم نئے اقدامات کے خلاف قانون کام کر رہا ہے تو وہ دکام کو اس کی رپورٹ کریں اور اگر وہ دس دن کے اندر رپورٹ نہیں کرتے تو ان کے خلاف بھی تادیبی کاروائی کی جائے گی۔ٹرمپ کے اس اقدام سے امریکی پرائیویٹ اداروں کو خوف ہے کہ انہیں بلاوجہ کی شکایات کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے نتیجے میں کام کی فضا ناخوشگوار ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ٹرمپ نے صدر لنڈن جونسن کا 1965 کا قانون بھی موقف کر دیا ہے جس کا مقصد سرکاری ٹینڈرز میں تعصب کو کنٹرول کرنا رہا تھا۔اس کے نتیجے میں چھوٹے اور اقلیتی اداروں کو سرکاری ٹینڈرز کا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا اور کسی تعصب کے نتیجے میں اپ اس کو کسی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کر سکیں گے۔

ٹرمپ ماحولیاتی اقدامات کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں انہوں نے سرکاری اداروں کو بھی ہدایت کی ہے کہ وہ ماحولیات کے متعلق اقدامات سے گریز کریں۔انہوں نے حلف اٹھانے کے فوراً بعد معاہدہ پیرس سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ انہوں نے الاسکا میں فوری طور پر تیل کے لیے ڈرلنگ شروع کرنے کا حکم دیا ہے اور پن چکیوں کے پرمٹس کے اجراء پر پابندی لگا دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کے ماحولیاتی اقدامات سے امریکہ پر زیادہ پابندیاں لگیں اور ان پابندیوں سے آزادی کے بعد امریکہ کو دیگر ممالک سے بھی مقابلہ کرنے میں آسانی ہوگی جو اس طرح کے ماحولیاتی اقدامات پر یقین نہیں رکھتے اور امریکہ کو معاشی ریس میں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔امریکہ کے ماحولیاتی ماہرین کا خیال ہے کہ ٹرمپ کے اس اقدام کے نتیجے میں سب سے زیادہ فائدہ چین کو ہوگا اور ٹرمپ کا یہ خیال غلط ہے کہ اس کے نتیجے میں امریکی صنعت کو فروغ ملے گا جبکہ اس کے نتیجے میں چین کی صنعتیں آزاد ہو جائیں گی کہ وہ ماحولیاتی اقدامات سے آزاد ہو کر اور زیادہ بے دردی کے

ساتھ ماحولیاتی الودگی کا اضافہ کریں گی جس کے نتیجے میں اوزون کی تباہ ہوتی ہوئی تہہ مزید تباہی سے دوچار ہوگی جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں درجہ حرارت میں اضافہ ہوگا اور سیلاب اور بارش اور طوفان جیسی آفات بڑھ جائیں گی۔گلیشیئرز کے گھلنے کا دورانیہ تیز ہو جائے گا۔انہوں نے انرجی ایمرجنسی بھی نافذ کر دی ہے جس کے نتیجے میں پاور پلانٹس کی تیاری کا کام برق رفتاری سے کیا جائے گا۔متعدد تیل پیدا کرنے والی کمپنیاں ٹرمپ کے اس اقدام سے خوش نہیں ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں تیل کی قیمتوں میں کمی واقع ہوگی اور ان کمپنیوں کے Profit میں نمایاں کمی ہوگی۔ امریکہ میں پہلے ہی دنیا بھر کے متعدد ممالک کے

معاہدہ پیرس سے علیحدگی۔ ماحولیاتی اقدامات غیر ضروری

مقابلے میں تیل کی قیمتیں پچھلے دو سال میں کم رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرق الوسطیٰ میں جاری اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں جب بھی کوئی نئی جنگ شروع ہوئی تو امریکہ میں تیل کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی تھی لیکن اس دفعہ تاریخی اسرائیلی جارحیت اور بربریت تھی لیکن امریکہ نے سعودی عرب سمیت تیل پیدا کرنے والے ممالک پر دباؤ ڈالا کہ وہ تیل کی پیداوار میں کمی نہیں ہونے دیں گے اور تیل کی قیمتوں کو بڑھنے بھی نہیں دیں گے کیونکہ اگر اس طرح سے ہوا تو اس کے نتیجے میں امریکہ میں اور دنیا بھر میں تیل کی قیمتوں کے بڑھنے سے ایک بھونچال ا جائے گا اور اسرائیلی جارحیت کے خلاف زیادہ آوازیں اٹھیں گی اور اگر امریکہ میں تیل کی قیمتیں بڑھیں اور امریکی عوام اس کے لیے شور مچائیں گے تو امریکی حکومت کے لئے اسرائیلی حکومت کی بربریت کی حمایت کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اپنی صدارت کا حلف اٹھانے کے چند گھنٹے بعد ہی صدر ٹرمپ نے امریکہ کی عالمی ادارہ صحت سے علیحدگی کا بھی اعلان کر دیا۔اسٹمپ کے خیال میں کرونا وائرس کی وبا کے دوران عالمی ادارہ صحت کا رویہ مایوس کن تھا۔اور اس ادارے میں موجود چین کے حامی ایسے اقدامات پر زور دیتے ہیں جس کے نتیجے میں چین کو فائدہ ہوتا ہے۔ماہرین صحت کا خیال ہے کہ ٹرمپ کے اس اقدام سے بھی امریکہ کے صحت کے اداروں اور ریسرچ کے اداروں کو نقصان پہنچے گا کیونکہ ان کو وہ تمام ڈیٹا میسر نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں وہ وبائی امراض کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ٹرمپ کا انتخابی نعرہ Make America Great Again ایک ایسا نعرہ تھا جس کے نتیجے میں امریکی عوام جو صدر بائیڈن کی پالیسیوں اور شخصیت سے متاثر نہیں تھے وہ ڈونلڈ ٹرمپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور انتخابات میں ڈونلڈ ٹرمپ کو واضح فتح دلائی۔ صدر بائیڈن کے چار سالہ دور حکومت میں بھی امریکہ کی تمام ریاستوں میں ڈونلڈ ٹرمپ کے حامی اپنی گاڑیوں پر مستقل ایسے ہی جھنڈے لگا کے گھومتے تھے جس پر ٹرمپ کی حمایت میں نعرے لکھے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے طول وعرض میں ٹرمپ کی حمایت میں جگہ جگہ بینر لگے رہے ہیں اور انتخابات جیتنے کے بعد تو ان میں اور شدت آ گئی ہے۔اور پھر ٹرمپ نے اپنے ان تمام حامیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے جنہوں نے چھ جنوری 2021 میں امریکی دارالحکومت پر دھاوا بول دیا تھا۔ان بلوائیوں کو صدر ٹرمپ کی مکمل حمایت اس وقت بھی حاصل تھی جب وہ ہر قیمت پر ٹرمپ کو وائٹ ہاؤس میں بٹھانا چاہ رہے تھے۔اس وقت کے امریکی نائب صدر پینس نے ٹرمپ کے ان اقدامات کی حمایت کرنے سے گریز کیا تھا اور ٹرمپ کے حامی یہ سمجھتے تھے کہ نائب صدر پینس کی کمزوری کی وجہ سے ڈونلڈ ٹرمپ کو 2021 کے انتخابات میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ انتخابی نتائج کو چیلنج بھی نہیں کر سکے اسی لیے 6 جنوری 2021 کے امریکی دارالحکومت پر حملے میں نائب صدر پینس کی جان بال بال بچی تھی۔اب ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ وہ اب اور طاقت کے ساتھ صدر ٹرمپ کی حمایت کر سکتے ہیں اور امریکہ کو دوبارہ دنیا کی ایک عظیم قوت بنا دیں گے۔

امریکہ کے سیاسی تجزیہ نگار امریکی صدر ٹرمپ کے اقدامات سے خوش نہیں ہیں ان کے خیال میں ٹرمپ امریکہ کو اندرونی طور پر طاقتور بنا کر دنیا بھر کے لیے ایک نئی امریکن ایمپائر تیار کرنے کا خواب رکھتے ہیں جسکے نظریات ہٹلر کے متشابہہ ھیں۔ اس کے علاوہ ٹرمپ کے نظریات کے نتیجے میں امریکہ مطلق العنانیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان کے خیال میں اکثریتی امریکہ ایک گہری نیند سو رہا ہے اور جب امریکہ جاگے گا تو امریکی سیاسی منظر نامہ ایک ایسی تصویر کشی کرے گا جو کسی بڑے طوفان کے بعد ہوتی ہے!

کراچی پریس کلب۔ اشرف شاد کی تصنیف

"شہناز احد سینئر صحافی ہیں۔ بے باکی اور جراتمندی ان کے نام اور کام دونوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ 'اطراف' کے قارئین کو وہ ایک نئی کتاب "کراچی پریس کلب" کے دلچسپ تعارف سے نواز رہی ہیں۔ ان کی تحریر میں سادگی لیکن شیرینی ہوتی ہے۔ کراچی پریس کلب دنیا بھر میں ایک آزاد علاقے کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ ہم نے بھی عمر عزیز کے بہت سے برس اس کلب کی چار دیواری میں گزارے ہیں۔ 2024 میں پریس کلب کی انتظامیہ نے ہمیں اعزازی رکنیت سے نوازا۔ ایک بہت ہی کامیاب تقریب منعقد کی۔"

اشرف شاد کی کراچی پریس کلب پر اہم کتاب

تحریر: شہناز احد

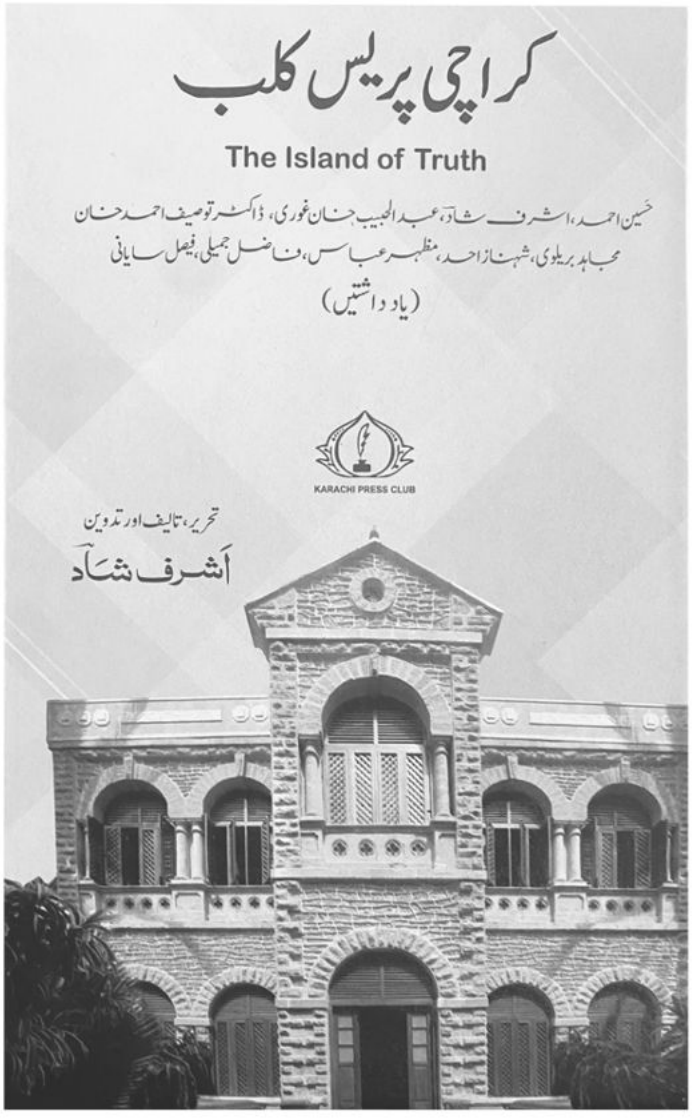

کراچی پریس کلب کا شمار میری منی سی معلومات کے مطابق پاکستان کے اولین پریس کلب میں ہوتا ہے۔ پچاس کی دہائی میں پاکستان میں انگریزوں کے چھوڑے ہوئے جم خانوں، سوشل کلبوں، نائٹ کلبوں کے بعد یہ واحد کلب بنا جس کے ممبر ایک مخصوص پیشے سے تعلق رکھنے والے صاحبان یعنی صحافی تھے۔

ابتدا میں اس کی روایات بھی اس وقت کے دیگر سماجی کلبوں سے ملتی جلتی ہی تھیں یعنی کھیلو کودو، پیو کھاؤ کچھ دیر کی ذہنی عیاشی کرو اور گھر جاؤ۔ پریس کلب کے ان خدوخال پر کسی کو اعتراض بھی نہ تھا۔ سب خوش باش بہتی گنگا میں نہاتے دھوتے رہے۔

میری اس تحریر کا مقصد ہرگز بھی پریس کلبوں کی تاریخ بیان کرنا یا ان کے بخیہ ادھیڑنا نہیں ہے۔

سانس آسٹریلیا میں۔ دل اور روح کراچی پریس کلب میں

میں نے یہ تمہید دوست، ساتھی، سہیلی، مشفق اور استادوں کی طرح سکھانے، بتانے والے اپنے بہت ہی عزیز اشرف شاد کی کتاب "کراچی پریس کلب" کے حوالے سے باندھی ہے۔

اشرف شاد بیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے وزیر اعظم سے لے کے جج صاحبان سمیت بہت سارے موضوعات کو بذریعہ قلم زندگی دی ہے۔ ان کی کتاب جلاوطن کو تو ایوارڈ بھی ملا ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے وہ اپنی حیات کا سفر نامہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس سفرنامے کو طے کرتے، کرتے یا لکھتے، لکھتے یہ ان کی تیسری کتاب کی آمد ہے۔ وہ کہتے ہیں جب میں اپنی اور ملک کی "زیر زمین سرگرمیوں" کا احوال لکھ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو ایک مکمل کتاب ہے لہٰذا انھوں نے فورا "انڈر گراؤنڈ" کے نام سے کتاب چھاپ دی۔ سفر اور آگے بڑھا تو "صحافت کے خار وگل" کے نام سے ایک اور کتاب نے جنم لیا اور اب کی بار ایک طویل سانس لے کے آگے کی جانب دیکھا تو "کراچی پریس کلب" سامنے آکھڑا ہوا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اس ملک کی صحافت اور سیاست میں کراچی پریس کلب کا کیا کردار رہا ہے۔ مجھے اس وقت ملک کے دوسرے پریس کلب بھی یاد آرہے ہیں۔ جیسے پنڈی پریس کلب، لاہور پریس کلب، حیدرآباد پریس کلب، میر پور خاص پریس کلب ان کی تبدیلی حالات کا سفر بھی ہم نے دیکھا ہے۔ او وہ بات آگے نکل گئی۔

اشرف شاد اور ان کے سیاسی قبیلے کے حضرات خوب جانتے ہیں کہ کراچی پریس کلب کے در و دیوار

کراچی پریس کلب۔اشرف شاد کی تصنیف

نے سیاست اور صحافت کے وہ، وہ رنگ دیکھے ہیں کہ ان دیواروں کو اگر زبان لگ جائے تو اتنی کہانیاں بیاں ہوں کہ کان پک جائیں۔

اشرف نے پریس کلب سے اپنی وابستگی کی قوس وقزح کے رنگ برساتے اور سمیٹتے ہوئے کچھ دوستوں کو بھی کتاب میں رنگ برسانے کے لئے مدعو کیا ہے۔

پریس کلب کے حوالے سے ہر ایک نے اپنی، اپنی بساط کے مطابق خوب رنگ بکھیرے ہیں اور یوں بکھیرے ہیں کہ" کراچی پریس کلب" کی اچھی خاصی تاریخ رقم ہوگئی ہے۔ جیسے مظہر عباس نے ایک عرصے سے تنازع کا شکار پریس کلب کی عمارت کی سپردگی کے واقع کو سپرد قلم کر کے اس واقعے کی ڈاکومینٹیشن کر دی ہے۔

فاضل جمیلی نے اپنی یادوں کے رنگوں کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے" ضیائی دور کے وزیر اطلاعات جنرل مجیب نے کراچی پریس کو علاقہ دشمن" قرار دیا تھا۔ ان ہی کی تحریر سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جنرل مشرف کے دور میں ڈی جی آئی ایس پی آر کے داخل کلب ہونے کے بعد اس وقت کی منتخب گورننگ باڈی کو گھر جانا پڑا تھا۔ اُن کے لکھے سے برسوں بعد یہ بات بھی ہم پر آشکار ہوئی کہ کلب کے کامریڈوں میں سے کامریڈ نعیم آروی مرحوم CSS پاس تھے لیکن پارٹی کے حکم پر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔

سیمابی کیفیت والے مجاہد بریلوی! میری یادداشت کے مطابق دو سے زائد مرتبہ کلب کے سیکریٹری اور اتنی ہی مرتبہ جوائنٹ سیکریٹری رہے ہیں اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً کلب کی ادبی کمیٹی کی سربراہی بھی ان کی گرفت میں رہی ہے۔ ان کا دور کلب کا خاصہ ہنگامہ خیز دور رہا ہے شاید اس لئے کہ عہدہ صدارت پر عبدالحمید چھاپرا براجمان ہوتے تھے۔ ان دو ہنگامہ خیز شخصیات کے دور میں کلب میں بہت بڑی، بڑی تقریبات کا انعقاد بھی ہوا جیسے بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو تشریف لائیں۔ حبیب جالب کو کلب کی اعزازی رکنیت دی گئی۔ مختلف گائیکوں نے موسیقی کے رنگ بکھیرے اور بلوچستانی سیاست کی بے شمار شخصیات بھی آتی جاتی رہیں۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں کراچی پریس کلب کا کردار مرکزی رہا ہے

مجاہد چاہتے تو اپنی یادوں کے بہت رنگ بکھیر سکتے تھے لیکن شاید کر نہ سکے۔

توصیف احمد خان کی پچیس صفحات پر پھیلی تحریر میں کلب کے انتخابات، ان کے طریقہ کار کی مختلف تبدیلیوں میں ان کی ذاتی کارگزاریوں کا کافی سے زیادہ تذکرہ ہے۔ کلب کے حوالے سے وہ بہت سی ایسی شخصیات کو بھی ضابطہ تحریر میں لائے ہیں جب شاید وہ خود ممبر بھی نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے پھر بھی کئی جگہ لگتا ہے کہ ان کی ذاتی پسند ناپسند کا اظہار بہت زیادہ ہے۔ جیسے محمود علی اسد مرحوم کا تذکرہ بار بار مختلف انداز سے کیا گیا ہے جب کہ عبدالحمید چھاپرا جو نہ صرف پانچ بار کلب کے صدر بنے اور جن کا کردار بحیثیت صحافی، سیاسی کے یو جے سے لے کر پی ایف یو جے تک پھیلا ہوا تھا ان کو مجاہد کے ساتھ ایک جملے میں یہ کہہ کے سمیٹ دیا کہ" عبدالحمید چھاپرا اور مجاہد بریلوی کے خلاف محاذ بنایا۔ بی بی بی گویا پریس کلب میں ان دونوں کا اس سے زیادہ عمل دخل نہ تھا، کچھ ایسا ہی برتاؤ انھوں نے صحافتی تحریکوں کے روح رواں منہاج برنا اور احفاظ الرحمن کے ساتھ بھی روا رکھا ہے۔

خیر ایسا بھی ہوتا ہے!

پریس کلب کے بہت سینئر رکن حسین احمد کوامین راجپوت نے انٹرویو کیا ہے۔ کتاب میں اس انٹرویو کی موجودگی سے کلب اور مختلف افراد کے نہ صرف تاریخی کردار کا پتہ چلتا ہے کلب کی نئی پرانی زندگی کے رنگوں کا احوال بھی قاری کو باندھے رکھتا ہے۔

ان گنت بار کلب کے سیکریٹری اور صدر رہنے والے حبیب خان غوری کی یادداشتوں کی بجھی ہوئی راکھ میں سے بہت کچھ نکالا جا سکتا تھا لیکن وہ بھی عمر کے اس حصے میں خیالات اور یادداشت کو یکجا رکھنے کے مسئلے کا شکار ہیں۔ بقول مصنف ان کے پاس سے باتوں کے علاوہ کچھ یادگار تصاویر بھی ملی ہیں۔

اس کتاب کے مصنف نے اپنے خیالات، جذبات، احساسات کو" آخر شب کے مسافر" کے عنوان تلے بیان کیا ہے۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اشرف شاد کو پاکستان چھوڑے جلد ہی آدھی صدی مکمل ہونے والی ہے لیکن یہ بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ وہ سانسیں بے شک آسٹریلیا یا دنیا کے کسی بھی شہر میں لیتے ہوں۔ ان کا دل اور روح پاکستان میں اور اس سے زیادہ کراچی پریس کلب میں سانس لیتے ہیں۔ شاید اسی روحانی تعلق کا اثر ہے کہ یادوں میں بسے پریس کلب کو یہ کتاب لکھ کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

پریس کلب، اس کی سیاست، مختلف کرداروں کے گرد گھومتا کلب، کارڈ روم، گوشہ کیرم بورڈ اس سے جڑی اچھی بری یادیں وغیرہ وغیرہ ان سب کا حال انھوں نے ایسے لکھا ہے جیسے وہ ان کمروں، برآمدوں، راہداریوں کی کسی میز پر بیٹھے سانس لے رہے ہوں یا گئے دنوں کی طرح دھواں اُڑا رہے ہوں۔

کراچی پریس کلب نامی یہ کتاب کلب کے بارے میں ایک اچھی خاصی دستاویز ہے۔ جس کے ذریعے مستقبل کی آنے والی صحافی نسلوں کو پتہ چل سکتا ہے کہ جس پریس کلب کو وہ صرف ایک" طعام گاہ" سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتے وہ کن، کن مرحلوں سے گزر کے اس روپ میں ان کو سمیٹے ہوئے ہے اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کے کلب کی ساکھ پر آنچ نہ آنے دی۔

کتاب کی تمام تحریروں میں ایک بات کی بہت تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ کلب کے کچھ گزرے کرداروں کو بالکل فراموش کر دیا گیا۔ اس بات کا اعتراف مصنف نے خود بھی کیا ہے کہ عبدالحمید چھاپرا کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھا گیا۔

اپنے زمانہ صحافت میں سفید لباس میں ملبوس دوپہر کا کھانا تناول کرنے والے واجد شمس الحسن کو بھی کسی نے قابل تذکرہ نہ جانا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ اور بہت سے کرداروں کے خدوخال بنانے، سنوارنے میں بھی کراچی پریس کلب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ خاص طور پر ایم آر ڈی کی تحریک کبھی سر نہ اٹھا پاتی اگر پریس کلب انھیں روز، روز آنے جانے، ملنے اور بات کرنے کی سہولت نہ دیتا تو مارشل لا کے اس دور میں تحریک کیا کرتی؟

لکھنے والوں نے دبے دبے الفاظ میں لکھا ہے کہ مختلف ادوار کے کن، کن حکمرانوں، ان کے لواحقین کو پریس کلب آنے کی حسرت تھی لیکن اب وقت بدل چکا ہے کلب آنے کی خواہشوں کو لئے زیر زمیں جانے والوں نے اتنے کارندے داخل کلب کر دیئے ہیں کہ گنتی محال ہے۔

کراچی پریس کلب کے بارے میں بحیثیت مجموعی یہ ایک ایسی تحریری دستاویز جسے خود اس کے لوگوں نے لکھا ہے۔ اس میں کردار بول رہے ہیں، بذریعہ قلم کرداروں کو زندہ کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد یہ خیال بھی آتا ہے کہ پریس کلب سے وابستہ کچھ اور لوگ بھی اگر اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو جگانے کی کوشش کریں تو مزا آجائے۔

اس کتاب کی تحریری ضخامت ایک سو چھیتر صفحات پر مشتمل ہے۔ تقریباً بیس صفحات میں سابقہ صدور اور سیکریٹری صاحبان کی تفصیل کے ساتھ ساتھ، کلب کے مرحوم ممبران کی تفصیل بھی ہے۔ اس سب کے ساتھ کچھ یادگار تصاویر بھی ہیں۔

کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔

”تہران سے وفا آئی خوشبوئیں بانٹتی رہی۔ ماہنامہ ’اطراف‘ کو اُردو کی اس باوفا سے خصوصی گفتگو پر فخر ہے۔ ہماری قلمی معاون جہاں آرا نے ڈاکٹر وفا یزداں منش سے پاکستان ایران تعلقات۔ ایران میں اُردو کی تدریس اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان کے دلچسپی کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔ ’اطراف‘ کی کوشش ہوگی کہ دوسرے ملکوں میں اُردو کی تدریس کی صورتِ حال کا جائزہ لیں۔“

ڈاکٹر وفا یزدان منش نے احمد ندیم قاسمی کے سارے افسانے بی اے کے دوران ہی پڑھ لیے تھے

تہران یونیورسٹی شعبہ اُردو میں اسسٹنٹ پروفیسر افسانہ نگار ڈاکٹر وفا یزداں منش سے جہاں آرا کی خصوصی گفتگو

تحریر: جہاں آراء

ایرانی نژاد ڈاکٹر وفا یزدان منش تہران یونیورسٹی شعبہ اردو میں اردو زبان وادب کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ آپ کے والد کا نام علی یزدان منش ہے۔ ویسے تو آپ کی مادری زبان فارسی ہے لیکن آپ تہران میں اردو کی سفیر ہیں۔ اور اردو زبان و ادب کی گرویدہ

تہران کے ٹی وی چینل سے اُردو خبروں کی ایڈیٹر بھی رہیں

ہیں۔ آپ ممتاز شاعرہ اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ اردو فارسی تراجم میں بھی آپ کا کردار قابل تحسین ہیں۔ علاوہ ازیں متعدد عالمی کانفرنسوں میں شرکت بھی آپ کی اہم خدمات میں شامل ہیں۔ اور اسی ضمن میں ۱۷ ویں عالمی اردو کانفرنس 2024 میں شرکت کے لئے کراچی، پاکستان تشریف لائیں۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے بھی ڈاکٹر وفا یزدان سے بیچ لگژری ہوٹل میں ملاقات کی اور ان کا ایک اہم انٹرویو ماہنامہ اطراف کے قارئین کے لئے

کیا۔ جب ڈاکٹر ذکیہ رانی کے ہمراہ میں ان کا انٹرویو کرنے پہنچی تو بڑی بے صبری سے انہیں اپنا منتظر پایا البتہ یہ الگ بات ہے کہ یہ بے صبری ہم سے ملنے کی نہیں بلکہ شہر کا ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے ہمارے پہنچنے میں تاخیر پر تھی۔ کیونکہ ہمارے بعد ان کی ایک اور میٹنگ تھی۔ لیکن جب انہیں یہ پتہ چلا کہ ان کا یہ انٹرویو ماہنامہ اطراف کی زینت بنے گا تو ہمارا تاخیر سے پہنچنا بھی ان پر گراں نہ گزرا بلکہ یہ امر کو باعث فخر مان کر وہ اس قدر خوش دلی سے محو گفتگو ہوئیں کہ خود بھی بھول گئیں کہ اس کے بعد ان کی ایک میٹنگ اور بھی ہے۔ اور ساتھ ساتھ انہوں نے گرما گرم چائے اور ایرانی چاکلیٹ سے ہماری تواضع بھی کی۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ انٹرویو پڑھنے کے بعد ہمارے قارئین اردو زبان وادب سے غیر معمولی شغف رکھنے والی ڈاکٹر وفا یزدان منش کی خدمات اور شخصیت کے ضرور گرویدہ ہوجائیں گے۔

تو بات ہم نے شروع کی ڈاکٹر صاحبہ کے کچھ تعارف سے کہ وہ کہاں پیدا ہوئیں اور تعلیم کہاں سے سے حاصل کی وغیرہ، جس پر آپ نے بتایا کہ آپ کی پیدائش تہران

کی ہے اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ اگرچہ ہائی اسکول میں سائنس کی طالب علم تھیں اور آپ کے والد کی خواہش تھی کہ آپ ڈاکٹر بنیں لیکن ان کی اپنی دلچسپی میڈیکل کے بجائے زبان و ادب میں تھی۔ اسی لئے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق رکھتی تھیں۔ اردو اور انڈین فلمیں بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھیں۔ اسی لئے اردو زبان سے آشنائی کے ساتھ ساتھ ایک خاص لگاؤ بھی پیدا ہوا اور فیصلہ کر لیا کہ اعلیٰ تعلیم اسی زبان میں حاصل کریں گی۔ اسی دوران آپ شادی کے بندھن میں بھی بندھ گئی تھیں اور اللہ نے آپ کو بیٹے سے بھی نوازا۔ ذمہ داری بڑھ جانے کے باعث فی الحال ملک سے باہر جانا مشکل تھا اسی لئے تہران یونیورسٹی سے اردو ادب میں بی۔ اے کیا اور نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ اردو ادب سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ احمد ندیم قاسمی کے سارے افسانے بی۔ اے کے دوران ہی پڑھ لئے تھے۔ ڈاکٹر زیب النساء علی خان بی۔ اے میں آپ کی پسندیدہ استانی تھیں۔ اتنی اچھی اردو سکھانے اور پڑھانے پر آپ ان کی احسان مند بھی ہیں۔ اس کے علاوہ تہران یونیورسٹی ہی کے فارسی استاد ڈاکٹر سلیم اختر سے بھی آپ نے اردو سیکھی۔ بی۔ اے کے دیگر مضامین سے متعلق سوال پر وفا صاحبہ نے بتایا کہ تہران

یونیورسٹی میں بی۔ اے کے لئے صرف ایک مضمون کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے سوال پر آپ نے یہ بھی بتایا کہ ان کے علاوہ گھر میں کسی اور کو اردو زبان نہیں آتی تھی اور نا ہی کسی کو سیکھنے کا شوق تھا۔ بی۔ اے کی تکمیل کے بعد آپ تہران کے ایک ٹی۔ وی چینل سے منسلک ہوئیں جس پر مختلف زبانوں سے متعلق پروگرام نشر کئے جاتے۔ اسی چینل پر اردو کے نام سے بھی ایک گھنٹے کا پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ یہاں پر آپ خبروں کی ایڈیٹر بنی۔ اور خبروں کے اردو تراجم بھی کئے۔ یہاں ایک سال کام کرنے کے بعد اردو سیکھنے اور پڑھنے کی لگن آپ کو پاکستان کھینچ لائی۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے آپ کو

ہم جماعت پاکستانی ہونے کے باعث نا صرف یہ کہ روانی کے ساتھ اردو بولا کرتے تھے بلکہ بڑی پھرتی کے ساتھ لیکچر بھی نوٹ کیا کرتے تھے۔ جبکہ آپ نا تو ٹھیک سے سمجھ پاتی اور نا ہی پھرتی سے لکھ پاتیں۔ اس صورتحال سے کبھی کبھی تو بہت ٹینشن کا شکار ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اپنی انتھک محنت اور اساتذہ کے تعاون سے یہ مشکلات آسان ہوتی گئیں۔ اور اردو لکھنے پر عبور حاصل ہوتا گیا۔ اسی دوران آپ خانہ فرہنگ میں فارسی بھی پڑھاتی رہیں۔ ڈاکٹر وفا نے بتایا کہ اس وقت انہیں خود اپنی قابلیت کا علم نہیں تھا ان کی محنت اور ہمت کو دیکھ کر ان کے اساتذہ ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کو بھانپ گئے تھے اور انہیں نکھارنے میں

اسکالرشپ بھی ملتا تھا۔ ہمارے سوال پر ڈاکٹر وفا نے بتایا کہ یہ اسکالرشپ پاکستان کی طرف سے ایرانی طالبعلموں کے لئے تھا۔ لہذا اسکالرشپ پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے (2001 سے 2003) ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدا میں تو آپ کو پنجاب یونیورسٹی میں بہت مشکلات پیش آئیں کیونکہ آپ اردو پڑھ تو سکتی تھیں لیکن بولنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ جبکہ دیگر بہت معاون ثابت ہوئے۔ ایم۔ اے کا تحقیقی مقالہ آپ نے فارسی شعراء پر لکھا۔

ایم۔ اے کے بعد واپس جا کر تہران یونیورسٹی میں تقریباً چار سال تک اردو پڑھاتی رہیں۔ لیکن چونکہ یہ ملازمت عارضی تھی اسی لئے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لئے دوبارہ پاکستان کا رخ کیا اور پنجاب یونیورسٹی ہی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی (2006 سے 2010) کی ڈگری حاصل کی اور اردو زبان و ادب سے بھرپور

سب سے زیادہ تحقیق کلام اقبال پر۔ دوسرے شعرا کا تقابلی جائزہ بھی

انداز میں شناسائی حاصل کی۔ اس عرصے میں آپ نے خانہ فرہنگ میں فارسی کے ساتھ ساتھ ایرانی طالبعلموں کو اردو بھی پڑھائی۔ اسی دوران اللہ نے آپ کو بیٹی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا۔ آپ کی بیٹی کی پیدائش چونکہ پاکستان میں ہوئی اس لئے بھی یہ سرزمین آپ کے لئے بہت محترم ہے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کی آپ دلدادہ ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے بعد شعبہ اردو تہران یونیورسٹی میں مستقل ملازمت اختیار کی۔ آپ کے پی ایچ ڈی مقالے کا موضوع تھا اردو غزلیات میں فارسی تلمیحات و تراکیب کا لسانی و تحقیقی مطالعہ (ولی سے لے کر اقبال تک)۔ آپ تا حال تہران یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ ایک ریسرچ کے سلسلے میں بھی چھ ماہ کے لئے انہیں پاکستان بھیجا گیا تھا۔ اس ریسرچ کا موضوع تھا ''انقلاب ایران کے بعد ایران سے متعلق اردو زبان میں لکھے گئے سفرنامے''۔ پاکستان اور ایران کے نظام تعلیم کے فرق سے متعلق سوال پر ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ۔ ایران میں بی۔ اے میں ایک مضمون کا انتخاب

وفا پروین شاکر کی دلدادہ۔ پاکستانی ڈراموں کی مداح

کرنا ہوتا ہے اور پاکستان کی طرح سالانہ امتحانات کے بجائے سیمسٹر سسٹم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں یونیورسٹی کی سطح پر زیادہ تر کتابیں انگریزی میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں جبکہ ایران میں فارسی زبان کو ترجیح دی جاتی ہے محض کچھ کتابیں حوالہ جات کے لئے انگریزی کی استعمال کی جاتی ہیں۔ ورنہ تو زیادہ تر کتابوں کا فارسی ترجمہ کر لیا جاتا ہے۔ خاص طور پر انقلاب کے بعد کتابوں کو ترجمہ کیا جانے لگا تا کہ لوگ فارسی پڑھیں۔ ایران میں لوگ اپنی زبان سے ایک خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور اسی میں تعلیم حاصل کرنا پسند کرتے ہیں۔ جبکہ پاکستان کی جامعات میں انگریزی زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ پاکستان اور ایران کے نظام تعلیم کا بنیادی فرق بھی ہے۔ جبکہ پاکستان کی جامعات کے تحقیقی کاموں

کے معیار سے متعلق سوال پر آپ نے کہا کہ، پاکستان میں پی ایچ ڈی کی سطح پر لکھے جانے والے مقالے بہت عمدہ اور معیاری ہوتے ہیں ۔ یہاں نئے نئے موضوعات پر کام کیا جاتا ہے جنہیں پڑھ کر میں بہت محظوظ ہوتی ہوں۔لیکن کتابوں کے معیار سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ یہاں شائع ہونے والی کتابوں میں موضوعات کی یکسانیت اور تحقیق کی کمی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ حوالہ جات بھی نہیں دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تنقید کو بھی زیادہ برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔جبکہ تحقیق اور تنقید کا عمل ساتھ ساتھ ہونا چاہئے۔

ہمارا اگلا سوال تھا کہ، تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں زیادہ تر کس قسم کے موضوعات پر تحقیق کی جاتی ہے؟ اس کے جواب میں ڈاکٹر وفا یزدان نے بتایا کہ، ابھی تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی کا آغاز ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔جبکہ ایم ۔اے کے طالبعلموں سے اتنی زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاتی ہیں۔البتہ وہاں پر ایم۔اے کے مقالہ جات اردو زبان ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ان مقالوں میں املا اور لغت کی بہت ساری غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن کی اصلاح اساتذہ کرتے ہیں لیکن طالبعلوں لکھوایا اردو ہی میں جاتا ہے۔موضوعات کی اگر بات کی جائے تو اقبال پر بہت کام ہوتا ہے،مختلف شعراء کے کلام کے تقابلی جائزے لئے جاتے ہیں۔میری نگرانی میں مقالہ لکھنے والے طالبعلموں سے میں زیادہ تر ایران اور پاکستان کے ادیبوں یا دیگر اصناف ادب کا تقابلی جائزہ لکھواتی ہوں۔البتہ کسی بھی ادبی شخصیت پر میں زیادہ کام نہیں کرواتی ہوں کیونکہ اس طرح ہم کوئی نئی تخلیق نہیں کر سکتے ہیں۔البتہ کسی ناول نگار یا افسانہ نگار کے کام میں کسی عمدہ پہلو کا جائزہ لیا جا سکتا ہے مثلاً خدیجہ مستور کے ناول میں وصف نگاری کا جائزہ، یا راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں انسانی نفسیات یا معاشرتی خدوخال کا جائزہ وغیرہ۔

ہمارا اگلا سوال ڈاکٹر صاحبہ کے شعری شغف سے متعلق تھا جس پر انہوں نے بتایا کہ پاکستان آنے سے پہلے کبھی میں نے شاعری نہیں کی تھی۔ سنا ہے کہ میرے نانا کی امی شاعرہ تھیں۔ان کا نام خورشید تھا۔وہ فارسی اور ترکی زبانوں میں شاعری کرتی تھیں۔لیکن ان کا کوئی کلام تحریری صورت میں موجود نہیں ہے،وہ زبانی شاعری کیا کرتی تھیں۔میرے نانا بھی کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ میں جب پاکستان آئی تو ابتدا میں تنہائی کا احساس بہت ہوتا تھا۔جسے کم کرنے کے لئے فارسی زبان میں کبھی کبھی کچھ اشعار لکھ لیا کرتی تھی۔لیکن ابھی چند ماہ قبل میں نے اپنی پرانی ڈائری پڑھی تو میں خود حیران رہ گئی کہ میں نے اتنے سارے فارسی شعر کیسے لکھ لئے تھے۔ پی ایچ ڈی مکمل ہونے کے تقریباً پانچ یا چھ سال کے بعد میں نے اردو میں اشعار لکھنا شروع کئے۔شعر کے وزن یا بحر کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے بس اپنے تخیل کو قلم کی نوک پر لے آتی ہوں۔ مجھے خود نہیں پتا کہ یہ

خانہ فرہنگ ایران میں وفا دانش کی تصنیف 'حکایت وفادر پاکستان' کی افتتاحی تقریب میں سید تقی عابدی، محمود شام اور بیگم محمود شام کے ساتھ

سب کیسے ہو جاتا ہے۔

جب ہم نے ڈاکٹر صاحبہ سے ان کے پسندیدہ شاعر کے بارے میں پوچھا تو بغیر سوچے جھٹ سے آپ نے پروین شاکر کا نام لیا۔انہوں نے کہا کہ مجھے شروع ہی سے پروین شاکر کی شاعری بہت پسند ہے۔اور میرا یہ ماننا ہے کہ کسی بھی فارسی کی شاعرہ سے ہم پروین شاکر کا تقابلی جائزہ پیش نہیں کر سکتے ہیں۔ان کی شاعری میں جو نسائیت اور نزاکت ہے وہ کسی اور کی

ایران میں اُردو کے فروغ کے لیے پاکستان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے

شاعری میں نہیں ہے۔موجودہ دور کے شعراء کرام میں سے میں افتخار عارف ،حمیدہ شاہین، زہرا نگاہ، یاسمین حمید اور پیر زادہ قاسم رضا صدیقی صاحب وغیرہ کے کلام سے بہت متاثر ہوں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ابھی تک ان کا کوئی شعری مجموعہ یا کلام شائع نہیں ہوا ہے۔انہوں نے کہا کہ وہ ابھی تک اپنی شاعری سے خود مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ شعر کی فنی خوبیوں کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔

افسانہ نگاری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟ کے جواب میں آپ نے بتایا کہ، افسانہ بھی میں نے تقریباً پچھلے پانچ یا چھ سال پہلے لکھنا

ڈاکٹر ذکیہ رانی۔ وفا۔ اور جہاں آرا

شروع کیا۔ میں بچپن میں اکثر ہندی فلمیں بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی چونکہ اردو اور ہندی ملتی جلتی زبانیں ہیں اُردو لکھنے پڑھنے سے دلچسپی پیدا کرنے میں ان فلموں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔اور ان فلموں ہی سے میں نے خود کہانی بنانا شروع کی۔اس ضمن میں آپ نے ایک دلچسپ واقع یہ بیان کیا کہ، کہانی سنانا مجھے بچپن ہی سے بہت پسند تھا۔ میں اکثر اپنی ہم جماعتوں اور سہیلیوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ میری ساری کہانیاں طبع پرور ہوتی تھیں لیکن میں انہیں یہ بتاتی کہ یہ کسی فلم کی کہانی ہے اس کے بعد میری سہیلیاں وہ فلم ڈھونڈتی رہ جاتی لیکن انہیں کوئی ایسی فلم نا ملتی جس کی کہانی میں نے سنائی ہوتی تھی۔ میں ان لمحات سے بہت لطف اندوز ہوتی تھی لیکن شاید کہیں نا کہیں اللہ نے مجھ میں یہ صلاحیت رکھی تھی کہ میں اپنی طرف سے کوئی کہانی بنا سکوں۔اور یہ صلاحیت آگے چل کر افسانے لکھنے میں کام آئی۔ اگر میری تعلیمی مصروفیات نا ہوتی تو میرا رجحان مکمل طور پر افسانہ نگاری کی جانب ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی میں اپنے لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع کروادوں۔ ہمارے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ ان کے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو ،غلام عباس وغیرہ شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے بھی سارے افسانے میں نے پڑھے ہیں لیکن ان کے زیادہ تر افسانوں میں مجھے یکسانیت نظر آئی ہے۔اس کے علاوہ ممتاز مفتی کے افسانے مجھے بہت پسند ہے۔ان کی افسانہ نگاری کے نفسیاتی پہلو مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ کیونکہ مجھے نفسیات کا مطالعہ بھی بہت پسند ہے اگر میں اردو کی طرف نہیں آتی تو پھر شاید نفسیات پڑھتی۔ حالیہ دور کے افسانہ نگاروں میں مجھے زاہدہ حنا بہت پسند ہیں۔اس کے علاوہ مجھے طنز و مزاح پڑھنے کا بھی شوق ہے۔میری حالیہ کتاب حکایت وفادر پاکستان میں بھی میں نے کہیں کہیں طرافت کی چاشنی گھولی ہے۔میری ایڈیٹر نے یہ کیاب پڑھنے کے بعد کہا کہ میں مزاح بھی لکھ سکتی ہوں۔

پاکستانی ڈراموں میں استعمال ہونے والی زبان کے معیار کے متعلق آپ نے کہا کہ، پاکستانی ڈرامے مجھے بہت پسند ہیں۔ان میں بہت

ادبی زبان و بیان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر ڈرامے ادیب ہی لکھتے ہیں۔اس کے علاوہ ان میں پاکستان کی تہذیب وثقافت اور معاشرے کے نفسیاتی مسائل کو بھی دکھایا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پرانے ڈرامے زیادہ عمدہ اور معیاری ہوتے تھے۔البتہ پاکستانی فلمیں مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہیں۔

ڈاکٹر وفا یزدان کی ایک کتاب ''نوسرایان اردو در سدہ بیستم'' (۲۰ ویں صدی کے شعراء کا تعارف) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔جس میں انہوں نے پانچ پاکستانی شعراء، پروین شاکر، ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، مجید امجد اور ن۔م راشد کے تعارف اور ادبی خدمات کو فارسی زبان میں متعارف کروایا ہے۔دوسری کتاب حال ہی میں شائع ہونے والی ''حکایت وفادر پاکستان ہے'' جو کہ پاکستان کا سفرنامہ ہے۔ یہاں ہمارا سوال یہ تھا کہ پاکستان سے متعلق سفرنامہ لکھنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟ جس پر انہوں نے کہا کہ سفرنامے پڑھنا مجھے بہت پسند ہے کیونکہ میں تہذیب سے دلچسپی رکھتی ہوں۔اور کسی بھی ملک کا سفرنامہ اس ملک کی تہذیب و ثقافت کا بھی عکاس ہوتا ہے اس لئے سفرنامے پڑھنے سے نا صرف یہ کہ مختلف تہذیبوں سے آشنائی حاصل ہوتی ہے بلکہ معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے ریسرچ کے دوران کئی سفرنامے ایسے دیکھے جو کہ ایران کے بارے میں لکھے ہوئے تھے۔لیکن پاکستان کے بارے میں سفرنامے مجھے بہت کم ملے۔تو اسی لئے مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام مجھے کرنا چاہئے۔ یہ پاکستان کا مجھ پر قرض بھی ہے اس سرزمین نے مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ بنایا ہے اور یہاں سے میری بہت حسین یادیں وابستہ ہیں تو کیوں نا اس احسان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے اور پاکستان کا سفرنامہ فارسی زبان میں لکھا جائے تا کہ ایران کے لوگ بھی پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے بہتر طریقے سے آشنائی حاصل کر سکیں۔بس اسی خیال نے مجھے سفرنامہ لکھنے پر آمادہ کیا جس کا اردو ترجمہ بھی عنقریب شائع ہو جائے گا۔علاوہ ازیں پاکستانی اردو ادب، تاریخ ایران و پاکستان کی تاریخی وثقافتی روابط پر آپ کے تحقیقی مقالات ایران، پاکستان اور ہندوستان کے کئی معتبر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔قارئین کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ'' حکایت وفادر پاکستان ہے'' کی تقریب رونمائی ۶ دسمبر ۲۰۲۴ کو خانہ فرہنگ ایران کراچی میں منعقد کی گئی تھی جس کی صدارت ماہنامہ اطراف کے مدیر اعلیٰ محترم محمود شام صاحب نے فرمائی تھی۔

اس کے علاوہ آپ دارۃ المعارف اسلام جہاں سے ایران کا مشہور انسائیکلو پیڈیا دانشنامہ جہانِ اسلام شائع ہوتا ہے، کے برصغیر سے متعلق تحقیقی شعبے میں اُردو زبان وادب کی نگران بھی ہیں اور یہ اہم فریضہ آپ تقریباً 20 سال سے انجام دے رہی ہیں۔ دارۃ المعارف اسلام کی خدمات کے متعلق ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ، یہاں اسلامی دنیا سے متعلق مختلف موضوعات یعنی جغرافیہ، ادب، سیاست، تہذیب و ثقافت، تجزیہ و تحقیق اور مشہور شخصیات کے حوالے سے بڑے پیمانے پر کام ہوتا ہے۔علاوہ ازیں مختلف اصناف ادب مثلاً طنز و مزاح، افسانہ، ناول یا اردو غزل، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ پر بھی کام کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی بھی اہم شخصیات خاص طور پر شاعروں اور افسانہ نگاروں پر یہاں بہت کام ہو چکا ہے۔لیکن یہاں ڈاکٹر صاحبہ نے ایک دلچسپ امر یہ بھی واضح کیا کہ دارۃ المعارف اسلام میں صرف ان شخصیات کی خدمات کو روشناس کروایا جاتا ہے جو حیات نا ہوں۔

ایرانی یونیورسٹیوں میں 'مطالعہ پاکستان' کے کورسز متعارف

پاکستان اور ایران کے ادبی روابط کے بارے میں استفسار پر ڈاکٹر وفا نے کہا کہ ،اس ضمن میں بہت مایوسی ہے۔خاص کر پاکستان کی جانب سے ایران میں اردو کے فروغ کے لئے کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے اور نا ہی ہمیں کوئی معاونت فراہم کی جا رہی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ دونوں ممالک کے شعبہ

جہاں آرا نے وفا صاحبہ کو ماہنامہ 'اطراف' پیش کیا

اطلاعات کو قریب آنا چاہیئے اور تراجم کے زریعے ایک دوسرے کے ادب اور زبان سے آشنائی حاصل کرنی چاہئے لیکن افسوس کہ ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔اپنی زبان وتہذیب کا فروغ ہر ملک کی ذمہ داری ہے۔ایران نے اس سلسلے میں کام کیا ہے اور تقریباً ہر ملک میں خانہ فرہنگ ایران قائم کیا ہے۔کیونکہ ایرانی طالبعلم فارسی کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔لیکن پاکستان کی طرف سے ایسے کوئی اقدامات نہیں کئے جا رہے ہیں۔جبکہ پاکستانی زبان و ادب کے فروغ کے لئے کام کرنے والے دیگر ادارے جن میں انجمن ترقی اردو، ادبیات اکیڈمی اور نیشنل بک فاونڈیشن وغیرہ بھی کوئی معاونت فراہم نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری توقعات صرف اتنی ہیں کہ ان اداروں کی طرف سے ہمیں کچھ معیاری کتابیں فراہم کر دی جائیں یا پھر اردو کے مختلف کورس کروا دیئے جائیں۔البتہ افتخار عارف اور نجیبہ عارف کی طرف سے ہمیں کچھ کتابیں ملیں تھیں۔ کچھ دوست بھی کتابیں فراہم کر دیتے ہیں۔باقی ہم خود اپنی یونیورسٹی کے لئے کتابیں خریدتے ہیں۔ یونیورسٹی میں پہلے اردو کے طالبعلموں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی جو دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ہم بہت کوشش کر رہے ہیں وہاں پی ایچ ڈی کے داخلوں کا آغاز کر دیں لیکن ابھی فی الحال یہ مشکل نظر آ رہا ہے۔البتہ یہ خوشی کی خبر ہے کہ وہاں مطالعہ پاکستان کے کا کورسز متعارف کروایا جا رہا ہے۔اس لئے امید ہے کہ ایران میں اردو کا مستقبل بہت اچھا ہوگا۔

ایک اور سوال کے جواب پر آپ نے کہا کہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اب کوئی اردو اخبار بھی نہیں آتا ہے۔ پہلے اخبار اردو آتا تھا جو اب وہاں نہیں ملتا ہے۔جبکہ سوشل میڈیا سے بھی اردو زبان کو فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان ہو رہا ہے۔ پاکستان کے سفر کی روداد پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ، میں نے پاکستان کے کئی شہروں کا سفر کیا ہے۔جن میں سے کئی کا ذکر میں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، میانوالی، چکوال، قصور، فیصل آباد، ساہیوال، بہاولپور، رحیم یار خان ،بلتستان، کوئٹہ، ملتان، خیر پور، سکھر، ٹھٹھہ ،حیدرآباد اور کراچی سمیت دیگر کئی اور شہروں کا سفر کیا ہے۔ان شہروں کی جامعات کے دورے بھی کئے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان کی خواتین تعلیمی میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ پاکستان کے ہر صوبے کا رہن سہن الگ ہے۔ یہاں اپنائیت کا بہت احساس ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ پاکستان سے مجھے بہت محبت ملی ہے۔پاکستان کے کھانے تیکھے ہونے کے باوجود مجھے بہت پسند ہیں۔خاص طور پر پکوڑے، کڑی، آلو کے پراٹھے اور گاجر کو حلوہ میں بہت شوق سے کھاتی ہوں۔ پکوڑے تو میرے بیٹے کو بھی پسند ہے اور گرما گرم پکوڑوں کے ساتھ دودھ پتی چائے لطف دوبالا کر دیتی ہے۔ایران میں چائے بغیر دودھ کے بنتی ہے لیکن مجھے پاکستان کی دودھ والی چائے بہت پسند ہے۔موسم کی بات ہوئی تو آپ نے کہا کہ نومبر کا مہینہ مجھے بہت پسند ہے اور میرے لئے لکی بھی ہے۔

ان ہی سوالات کے ساتھ ہمارا انٹرویو ختم ہوا۔شفاف چہرہ اور دھیمے لب و لہجے کی حامل ڈاکٹر وفا یزدان کا صرف نام ہی وفا نہیں ہے بلکہ آپ خود سراپا وفا ہیں۔آپ غیر معمولی ذہین خاتون ہیں۔آپ کے ساتھ گزارے گئے یہ لمحات بہت یادگار تھے اور مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کی یہ روداد پڑھنے کے بعد اطراف کے قارئین بھی ان لمحات سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوں گے۔آخر میں ہم نے ڈاکٹر وفا یزدان کو ماہنامہ اطراف کا ماہ نومبر کا شمارہ بھی پیش کیا۔

ماہنامہ 'اطراف' نے ایک اور خصوصیت حاصل کی ہے کہ اخبارات میں عوام کے خطوط کا تحقیقی اور علمی تجزیہ۔ اس عنوان کے تحت شروع کیا ہے۔ ہم نے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ کے ڈائریکٹر اور ماہنامہ 'اطراف' کے قلمی سرپرست ڈاکٹر سید جعفر احمد سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست کی تھی ان کی عنایت ہے کہ وہ باقاعدگی سے تین انگریزی اخبارات ڈان۔ ایکسپریس ٹریبیون اور بزنس ریکارڈر میں شائع ہونے والے خطوط کا تجزیہ ہر ماہ اہتمام کیا ہے۔

پاکستان ڈجیٹلائزیشن کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہا

تحریر: ذکیہ عباسی، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

BUSINESS RECORDER

اس مضمون میں 15 دسمبر 2024ء اور 15 جنوری 2025ء کے دوران تین انگریزی اخباروں 'ڈان'، 'ایکسپریس ٹریبیون' اور 'بزنس ریکارڈر' میں عوام کی طرف سے بھیجے جانے والے خطوط کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کے اس حصے میں شایع ہونے والے زیادہ تر خطوں کے ذریعہ عام قارئین اپنے گردوپیش کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیے جانے والے اقدامات اور ان کے پاکستان پر ہونے والے اثرات پر اپنی رائے بھی دی جاتی ہے۔

اگر ہم تینوں انگریزی اخبارات کے شعبے 'لیٹر ٹو دی ایڈیٹر' میں شایع ہونے والے خطوط کا آپس میں موازنہ کریں تو ان تینوں اخبارات میں شایع ہونے والے خطوط کا نقطۂ ماسکہ کچھ حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ 'ڈان' اور 'ایکسپریس' میں اس اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے کہ ان میں شایع شدہ خطوط میں روزمرہ مسائل زیادہ اجاگر ہوئے

خطوط میں فوجی عدالتوں کا دفاع اور تنقید

ہیں اور حکام اعلیٰ کی ان مسائل کی جانب توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جبکہ 'بزنس ریکارڈر' میں شایع ہونے والے خطوط میں زیادہ تر معیشت اور بین الاقوامی سطح پر کیے جانے والے سیاسی مذکرات اور اقدامات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان تینوں اخبارات کے اس حصے کا مقصد ملک وقوم کے مسائل کو اجاگر کر کے ان کے حل کے لیے حکام بالا سے درخواست کرنا ہے۔ شایع ہونے والے خطوط میں اکثر ایک موضوع پر بار بار خطوط بھی لکھے جاتے ہیں۔ ذیل میں چند منتخب شدہ خطوط کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

DAWN

دہشت گردی

حسن افضل نے پاراچنار میں پیش آنے والے سانحے پر پاراچنار میں کئی عشروں پر محیط مختلف قبائل کے درمیان زمینی تنازعات کی تاریخ طویل عرصے سے فرقہ وارانہ تشدد میں بدل چکی ہے اور جس میں اب تک ہزاروں جانیں جا چکی ہیں، جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں۔ متحارب گروہ اپنے غیر انسانی رویے کی تمام حدیں پار کر چکے ہیں۔ اس خطے کو اشیائے ضروریہ کے ساتھ ساتھ طبی سہولیات کی شدید قلت کا سامنا ہے اور وہاں کے لوگوں کو ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ صرف مستقل بنیادوں پر امن چاہتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی اور انصاف کی منصفانہ تقسیم گزرے دنوں کی کہانی بن چکی ہے۔ متحارب گروہوں نے پورے پاراچنار شہر اور اس کے گردونواح کو ایک جنگی علاقے میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں قتل وغارت گری اور گھروں اور دیگر تمام املاک کو نذر آتش کرنا عام ہو گیا ہے۔ اس طرح کی کارروائیاں انسانی حقوق اور آئین کی صریح خلاف ورزی ہیں، جو ذات پات، مسلک، سماجی، مذہبی اور فرقہ وارانہ وابستگیوں سے قطع نظر ملک کے ہر شہری کی جان ومال کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

Letter to the editor

THE EXPRESS TRIBUNE

پاراچنار میں تشدد، خونریزی اور کسی بھی قسم کی لاقانونیت کے اظہار پر قابو پانے میں صوبائی اور وفاقی حکومتوں کا غیر مؤثر کردار قابل مذمت ہے۔

دھرنوں کی سیاست

ہمارے ملک میں بڑھتے ہوئے احتجاجی رجحان کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کا اپنے خط میں اظہار کرتے ہوئے وردہ یونس کہتی ہیں کہ اپوزیشن کی مرکزی جماعت کی طرف سے سیاسی چالبازی کی حالیہ کوشش ان کو وہ فراہم نہ کر سکی جس کی وہ تلاش کر رہی تھیں، لیکن اسلام آباد اور راولپنڈی کے رہائشیوں کے لیے پریشانی کا باعث بنی اور اس کی کچھ وضاحت بیان کرتے ہوئے مراسلہ نگار نے بتایا کہ پیٹ میں درد میں مبتلا ایک شخص ایمبولینس میں ہی دم توڑ گیا کیونکہ وہ سڑک بند ہونے کی وجہ

2014 کے بعد سے ہندوستان علاقائی بالادست بن رہا ہے

سے ہسپتال نہیں پہنچ پایا تھا۔ ایک عورت شادی کے ۱۷ سال بعد امید سے تھی اور احتجاج کے دوران وقت پر ہسپتال نہ پہنچنے کی وجہ سے خاتون اور اس کا پیدا ہونے والا بچہ جان کی بازی ہار گئے۔ احتجاج کے دوران انتقال کر جانے کے بعد ایک بیٹا آخری بار اپنے باپ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ یہ احتجاج ہمیں قدیم دور میں لے گئے ہیں جب مناسب نقل وحمل، طبی خدمات اور انٹرنیٹ نہیں تھا۔ دائیں بائیں اور مرکز میں احتجاج کی کال دینے والوں کو عوام کے حقوق کا بھی سوچنا چاہیے۔

اسی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ریٹائر لیفٹیننٹ کرنل سید

افتخار احمد نے لکھا کہ قائداعظم دھرنوں کی سیاست کے مخالف تھے کیونکہ اس طرح کی سیاست میں ہم صرف اپنے حقوق اور مراعات کی بات کرتے ہیں اور دوسرے کے حقوق کا کوئی احترام نہیں کرتے۔ سیاست کا ایک سنہری اصول یہ ہے کہ ایک کی آزادی وہیں ختم ہوتی ہے جہاں سے دوسرے کی ناک شروع ہوتی ہے۔ ان دھرنوں سے شہری زندگی میں بہت خلل پڑتا ہے۔ ملک میں سیاسی جماعتوں کو دھرنے کی سیاست سے پرہیز کرنی چاہیے اور تجویز پیش کرتے ہوئے کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ یہ معاملہ ضلعی انتظامیہ کی سطح پر نہ چھوڑا جائے بلکہ دھرنوں، بھوک ہڑتالوں اور سڑکوں کی بندش کو روکنے کے لیے پارلیمنٹ سے ایک بل پاس کروانا چاہیے اور ساتھ ہی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہر شہر میں ایک مخصوص جگہ دھرنوں کے لیے مختص کرے اور ان جگہوں پر میڈیا کی معاونت بھی فراہم کری۔

آصف لنگڑیال نے حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ میڈیا رپورٹس کے مطابق پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے بانی چیئرمین عمران خان کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اگر حکومت ان کی پارٹی کے کارکنوں کی رہائی سے متعلق دو مطالبات پورے کرنے میں ناکام رہی تو وہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو ترسیلات زر روکنے کے لیے کال کریں گے۔ سمندر پار پاکستانیوں کی اکثریت، خاص طور پر بحر اوقیانوس کے دونوں جانب رہنے والے، عمران خان کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں جب وہ برسر اقتدار آئے تو تارکین وطن نے ان سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں، کیونکہ ان کی حکومت نے بیرون ملک مقیم افراد سے ملک میں سرمایہ کاری کرنے کی اپیل کی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک میں آنے والے ترسیلات زر ہماری حکومت کو بیرونی قرضوں کی ادائیگی کے لیے بنیادی مدد فراہم کرتا ہے۔ میری نظر میں حکومت کو اس کی دھمکی کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور اس کے ساتھ مزید وقت ضائع کیے بغیر بات چیت کا آغاز کرنا چاہیے تاکہ ملکی معیشت کو مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

ملٹری کورٹس

آج کل پاکستان میں فوجی عدالتوں کا بڑا چرچا ہے اور عوام ان کی کارکردگی کا ہر نقطہ نظر سے جائزہ لے رہے ہیں۔ واصف خالق داد نے ۲۲ دسمبر کو شائع ہونے والے اداریہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ یہ عدالتیں ابتدا میں دہشت گردی کے مقدمات کو نمٹانے کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ فوجی عدالتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے، غیر شفاف ہوتی ہیں، ان میں کوئی آزاد قانونی نگراں مقرر نہیں ہوتا، جج بھی فوج ہی کہ نمائندے ہوتے ہیں۔ ملزمان کو آزاد قانونی نمائندوں تک رسائی حاصل نہیں ہوتی ہے، اور مقدمے کی کارروائی کے بارے میں عوام کو محدود آگاہی حاصل ہوتی ہے اور یہ تمام مسائل آزادانہ اور منصفانہ ٹرائل کے حق میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ مزید برآں واضح کیا کہ یورپی عدالت برائے انسانی حقوق نے ۱۹۹۸ء میں فیصلہ دیا کہ عام شہریوں کے لیے فوجی ٹرائل غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس طرح فیصل احمد نے اپنے خط میں فوجی عدالتوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فوجی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت کے دوران ملزمان کے قانونی حقوق کو برقرار رکھا جاتا ہے، جن میں وکیل کا انتخاب، سماعت کے دوران خاندان کے افراد کی حاضری اور فوجی عدالت کے فیصلے کے خلاف پاکستان سپریم کورٹ سمیت متعدد سطحوں پر اپیل دائر کرنے کی اجازت شامل ہے۔ مسلح افواج کے سخت نظم وضبط کو کمزور سا لمیت کی علامت نہیں سمجھنا چاہیے۔ فوجی عدالت کی کارروائی میں شامل افسران انصاف کی فراہمی کے لیے انتہائی ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایسی کارروائیوں پر بے جا تنقید پر نظر ثانی کی جانے کی ضرورت ہے۔

بدعنوانی اور اداروں کی نااہلی

حماد حسنین کے خط کے مطابق پاکستان میں عدالتی عملے میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کلچر تشویشناک حد تک پھیل چکا ہے۔ عدلیہ اور حکومت نے اس کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے لیکن مسئلہ جوں کا توں ہے۔ اہلکار اکثر بہت کم رقم کے لیے کارروائی کو اگلی تاریخ تک تبدیل کر دیتے ہیں، یا اگر ان کی ہتھیلیوں میں پیسہ نہ دیا جائے تو کارروائی میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ آخر میں حماد حسنین نے کہا کہ ملک میں عدلیہ اور حکومت کے احتساب کے عمل کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

حسب سے محمد اشرف نے لکھا کہ میں کراچی میں اکثر آتا ہوں، اور ہر ایک دورے پر میں نے دیکھا کہ شہر میں پارکنگ کا نظام خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ٹریفک پولیس اہلکار خود اس کی ایک بڑی وجہ بنتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اپنے شکار کو پکڑنے کے لیے تنگ گلیوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ حال ہی میں، ٹریفک پولیس نے بغیر کسی معقول وجہ کے مجھ پر جرمانہ عائد کیا۔ مجھے بے بس ہو کر یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ متعلقہ حکام سے گذارش ہے کہ وہ اس سلسلے میں فوری ایکشن لیں۔ مزید برآں، ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کی کرپشن پرسیپشن انڈیکس ۱۸۰ ممالک میں سے ۱۳۳ ویں نمبر پر بدعنوانی اور شفافیت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے جمہوری اداروں پر اعتماد بحال کرنے اور قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانے کے لیے ساختی اصلاحات ضروری ہیں۔ سول سوسائٹی کو مضبوط کرنا، عدلیہ کی آزادی کو بڑھانا اور منصفانہ انتخابی عمل کو یقینی بنانا زیادہ مستحکم جمہوریت کی جانب اہم اقدامات ہیں۔ حکومت کو پاکستان کے مستقبل کے تحفظ کے لیے معاشی اصلاحات، شفافیت کو بہتر بنانے اور سیاسی معاملات میں غیر جمہوری قوتوں کی شمولیت کو محدود کرنے کی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی امور

سرگودھا سے چوہدری عامر سہیل صاحب کے مطابق ترقی پذیر ممالک

اخبارات وجرائد میں قارئین کے خطوط

اخبارات میں قارئین کے خطوط کا گوشہ ابتداء ہی سے اخباری صحافت کا لازمی جز و بنا رہا ہے۔ اخبارات ہی نہیں بلکہ ماضی میں ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامہ جرائد بھی قارئین کے خطوط کے لیے صفحات مختص کرتے تھے۔ قارئین کے خطوط کا یہ شعبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ جمہوری مملکتوں میں جہاں صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون سمجھا جاتا ہے وہاں قارئین کے خطوط کو رائے عامہ کے اظہارِ خیال کا ایک بڑا فورم اور پلیٹ فارم سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے جمہوری ملکوں میں آج بھی اخبارات قارئین کو اظہارِ خیال کے لیے بڑی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قارئین کے خطوط کے لیے مختص جگہ کم ہوتے ہوتے اب اردو اخبارات میں تو تقریباً مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ جہاں ایک طرف اخبارات کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے، ان کے صفحے کم ہو رہے ہیں اور اشتہارات سے مالکان بے دریغ کمائی کر رہے ہیں وہاں دوسری طرف قارئین کے لیے اظہارِ خیال کی جگہ ختم کر دی گئی ہے۔ ماضی میں روزنامہ 'جنگ'، 'نوائے وقت'، 'جسارت' اور 'امن' وغیرہ باقاعدگی سے خطوط شایع کرتے تھے۔ اخبارات کے علاوہ جرائد میں بھی خطوط کے لیے جگہ مختص ہوتی تھی۔ ہفت روزہ 'زندگی' میں قارئین کے خطوط کے صفحے کا عنوان 'مسئلہ یہ ہے' تھا۔ ہفت روزہ 'صحافت' نے اپنے صفحے کا نام 'بیٹھک' رکھا تھا، ہفت روزہ 'معیار' میں 'خطوط' کے نام سے صفحہ چھپتا تھا جبکہ 'لیل ونہار' میں اس صفحے کا نام 'نامہ و پیام' تھا۔ انگریزی اخبار 'دی مسلم' میں جو ایک زمانے میں بڑا مقبول اخبار تھا 'لیٹر ٹو دی ایڈیٹر' چھپا کرتا تھا۔ ان دنوں صرف گنتی کے دو تین اخبارات میں قارئین کے خطوط چھپتے تھے۔ ان میں 'دی نیوز' کا عنوان 'نیوز پوسٹ' ہے۔ 'بزنس ریکارڈر' اور روزنامہ 'ڈان' نے ان خطوط کے لیے 'لیٹر ٹو دی ایڈیٹر' کا شعبہ بنا رکھا ہے۔ 'ڈان' کا اہتمام اس سلسلے میں زیادہ پیشہ وارانہ اور ذمہ داری کا حامل ہے کیونکہ اس شعبے کے انچارج آنے والے ہر خط کی موصولی کی اطلاع مکتوب نگار کو بھیجتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اگر خط قابلِ اشاعت ہوا اور شارٹ لسٹ کر دیا گیا تو اگلے دس دنوں میں اس کو شائع کر دیا جائے گا۔

کشیر الجہتی کے جھنڈے تلے دوبارہ متحد ہو رہے ہیں۔ یہ ممالک زیادہ تر افریقی اور ایشیائی ہیں جن کا نوآبادیاتی ماضی رہا ہے، ان کا نوآبادیاتی دور کے بعد کا سفر شناخت کے بحران، ثقافت اور سماجی اصولوں جیسے چیلنجوں سے دوچار ہے۔ششی تھرور اپنی کتاب Inglorious Empire میں بیان کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی حکمرانی کے دوران ہندوستانیوں کو کس طرح معاشی لوٹ مار کا نشانہ بنایا گیا، جس نے ہندوستان کو مالیاتی، خام مال اور خود کو برقرار رکھنے والی صنعتوں، خاص طور پر اس وقت کی خوشحال ٹیکسٹائل صنعت سے محروم کر دیا۔ستم ظریفی یہ ہے کہ دنیا بڑی حد تک یہ سمجھتی ہے کہ استعمار کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔مغرب کا استعماری ایجنڈا زندہ ہے اور اسرائیل میں صیہونی حکومت کی شکل میں موجود ہے۔ اس غیر قانونی منصوبے نے پورے مشرقِ وسطیٰ میں ایک خوفناک خون کی ہولی شروع کر دی ہے۔ مراسلہ نگار نے مغرب کو تنقید کا نشانہ بناکر کہا کہ مغرب اپنے آپ کو امن کا پرستار کہتا ہے لیکن اربوں ڈالر مالیت کے ہتھیار اور امداد بھیج کر اسرائیل کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بشیر بھٹی نے بزنس ریکارڈر کی ایک خبر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایشیائی ترقیاتی بینک (ADB) نے پاکستان میں بجلی کی تقسیم کے بنیادی ڈھانچے کو جدید بنانے اور قابلِ اعتماد بجلی فراہم کرنے کی تقسیم کار کمپنیوں کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے بظاہر ایک بڑے قرض کی منظوری دے دی ہے۔ بلاشبہ، یہ ایک بامعنی قدم معلوم ہوتا ہے جس کا مقصد ملک میں بہتری لانا ہے۔ خاص طور پر بجلی کی ترسیل کا نظام خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ ADB کے قرض کو نئی ٹیکنالوجیز کو ملک میں لانے کے لیے بھی خرچ کرنا چاہیے تاکہ جس سے بجلی کے نظام کی کارکردگی کو بڑھایا جاسکے۔

ساجد درانی نے ڈھاکہ کی شکست کے نام سے خط لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے، جیسا کہ معروف ادیب قمر سومرو نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ہماری تاریخ کا سب سے دردناک واقعہ ہے۔انہوں نے دوسری چیزوں کے علاوہ اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے کہ بہت کم لوگ اس دردناک واقعہ کو یاد کر کے سوگوار ہوتے ہیں۔ ہر سال ۱۶ دسمبر کا دن سخت سردی اور سکون کے ساتھ آتا اور چلا جاتا ہے بغیر سوگ اور غم کے۔ایک ذلت آمیز زوال پر منتج ہونے والے ہولناک واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی جاتی۔ ہمارے حکمران جو اپنی خوبیوں کے گیت گاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے، شاذ و نادر ہی اپنے دردناک ماضی پر غور کرتے یا ہمیں خصوصاً نوجوان نسل کو آگاہ کرنے کے لیے وقت نکالتے ہیں کہ کس طرح ہماری حماقتیں ایک بڑے مسلم ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا باعث بنیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تاریخ کا ایک اہم موضوع ہے کیونکہ یہ نوجوان نسل کے نقطہ نظر کو تشکیل دیتا ہے۔ ڈھاکہ کی شکست کے بارے میں ہماری حکومتوں کا نقطہ نظر انتہائی قابلِ اعتراض رہا ہے کیونکہ ۱۹۷۱ء میں پیش آنے والے اس سانحے سے سبق سیکھنے کے لیے ملک کی کسی بھی حکومت نے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مطیع الرحمان ڈھاکہ سے سارک کے چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سارک ممالک کے درمیان تجارت کی صلاحیت کو کئی رکاوٹیں درپیش ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ خطے کی سب سے بڑی معیشت، ہندوستان، خطے کی ریاستوں کے درمیان تجارت کو فروغ دینے کی مجموعی کوششوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ 2014ء میں سنگھ پریوار کی بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد سے ہندوستان علاقائی بالادست بننے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ یہ پورے بحر ہند اور اس سے بھی آگے کا پولیس مین بننا چاہتا ہے۔ بھارت کے مذموم عزائم کو چیلنج کرنے والے ممالک بالخصوص پاکستان کو مخالفت اور دشمنی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ریحانہ سعید لکھتی ہیں کہ برصغیر کی تقسیم نے ہم آہنگ قوموں کے بغیر ریاستوں کو جنم دیا۔ دوسرے خطوں کے برعکس، جہاں قوموں

سندھ بلوچستان میں تعلیمی نظام دگرگوں

نے ریاستوں کو پروان چڑھایا، ہمیں نسل پرستی، مذہبی توہم پرستی اور لسانی تقسیم سے ٹوٹے ہوئے ممالک وراثت میں ملے۔ اتحاد قائم کرنے میں اس ناکامی نے اندرونی تنازعات، علاقائی تنازعات اور علیحدگی کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ مذہب، جو کبھی متحد کرنے والی قوت تھا، نفرت کا ایک ذریعہ بن چکا ہے، فرقہ وارانہ تقسیم اور انتہا پسندانہ ایجنڈے ریاستی استحکام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ہماری تاریخ جنگوں اور عدم تحفظ سے عبارت ہے۔ آسام سے بلوچستان اور سری لنکا سے افغانستان تک۔ کمزور قیادت اور بدعنوان سیاست نے علاقائیت اور لسانی رکاوٹوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دی ہے جس سے منقسم ریاستوں کا پیچھا کیا جارہا ہے۔ مذہبی فکر کے اندر ارتقاء کی کمی نے ہمیں جدید دنیا سے مزید دور کر دیا ہے اور ہمیں صدیوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حل اتحاد اور تنوع میں مضمر ہے۔

تعلیم

حال ہی میں سندھ کے وزیرِ تعلیم نے سرکاری کالجوں میں اے لیول کی کلاسز شروع کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا ہے۔ جس پر خیام درانی نے اپنے خط کے ذریعے ان خدشات کا اظہار کیا ہے کہ اس سے طلباء دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے ایک وہ جو مالی اعتبار سے اچھے خاندانوں سے ہیں وہ کیمبرج سے تعلیم یافتہ ہوں گے، اور دوسرے عام لوگ جو اپنی مالی استطاعت کی بنیاد پر روایتی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کراچی (BIEK) سے سلسلہ تعلیم کا انتخاب کریں گے۔ حکومت کو ایسا کرنے کی بجائے کالج کی سطح پر تعلیم کا معیار بہتر کرنا چاہیے، نصاب پر نظرثانی کرنی چاہیے اور BIEK کو مزید موثر بنانا چاہیے۔

ماجد مہری کے خط کے مطابق ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں فرسودہ داخلہ پالیسیاں بہت سے طلباء کو اعلیٰ تعلیم سے دور رکھتی ہیں۔ یہ پالیسیاں انٹرمیڈیٹ اور میٹرک کے نمبروں کی بنیاد پر میرٹ کا حساب لگاتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر ان نمبروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور طلباء کی امتیازی خوبیوں، صلاحیتوں اور کامیابیوں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ میرٹ کا یہ معیار طلباء کو ان کی اپنی پسند کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ حاصل کرنے کے امکانات کو متاثر کرتا ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کو مناسب تشخیص کے لیے ایسا طریقے متعارف کروانے چاہئیں جو طلباء کے لیے اندراج کے بہتر مواقع فراہم کر سکیں۔

امتیاز اختر کے مطابق دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تمام مدارس کے طلباء کو پیشہ ورانہ ہنر سکھایا جانا چاہیے تاکہ وہ باعزت روزی کما سکیں۔ مہارت کے بغیر، ان طلباء کے پاس ملازمت کے لیے صرف چند ہی مواقع ہوتے ہیں۔ تاہم اگر مدارس کے طلباء ساتھ میں کوئی ہنر سیکھتے ہیں یا پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ ملازمت کے لیے زیادہ مواقع تلاش کر سکتے ہیں۔ لعل صبا انور تربت سے لکھتی ہیں کہ "بلوچستان کے تعلیمی نظام کو در پیش سب سے اہم مسائل میں بنیادی انفرااسٹرکچر کی کمی ہے۔ صوبے بھر میں بچوں کی بڑی تعداد اسکولوں سے باہر ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کی۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیمی رسائی میں دیہی اور شہری تقسیم وسیع ہو رہی ہے، تقریباً ۱۸ ملین سکول نہ جانے والے بچے دیہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ۱۶۰۰۰ سے زیادہ تدریسی عہدے خالی ہیں، اور حکومت نے ابھی تک کوئی حل تلاش نہیں کیا ہے۔ تعلیم ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ ہنر مند اساتذہ کی کمی کی وجہ سے بہت سے اسکول اور کالج عملی طور پر غیر فعال ہیں، اور اس سے اسکول چھوڑنے کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومت بلوچستان اور متعلقہ حکام صوبے میں تعلیمی نظام سے متعلق مسائل کے حل کے لیے ضروری اقدامات کریں۔

صحت

پروفیسر خالد حسن محمود نے اپنے خط میں ۱۹ دسمبر کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک ریٹائرڈ پبلک ہیلتھ پریکٹیشنر کے طور پر، میں یہاں ہر کسی کے غور و فکر اور معلومات کے لیے کچھ نکات کو دوبارہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مارچ ۱۹۹۵ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک آدمی نے اپنے کالموں میں لکھا تھا کہ اورل پولیو ویکسین (OPV) کے استعمال سے پاکستان میں پولیو کی وبا پھیل جائے گی۔ اس وقت، میں نے اور ایک سینئر ماہر اطفال نے OPV کے استعمال کی حمایت کی تھی۔ اس کے بعد، جب حفاظتی ٹیکے لگوانے والے بچوں میں فالج کے کیسز کی اطلاع ملی تو اخباروں میں خطوط شائع ہوئے جس میں یہ پیغام دیا گیا تھا کہ جو بچے پہلے ہی حفاظتی ٹیکے لگوا چکے ہیں ان کو پولیو کے خلاف OPV کی زیادہ خوراک لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان خطوط میں دوسرا نکتہ ماحولیاتی صفائی ستھرائی میں بہتری کے بارے میں تھا کیونکہ یہ وائرس خوراک یا پانی کے ذریعے پھیلتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کی پالیسی یہ نہیں تھی کہ اس طرح کے واقعات کو عوامی سطح پر قبول کرے یا متاثرین کی بحالی کا طریقہ کار وضع کرے۔ میں نے کراچی کے شہری اور نیم شہری علاقوں میں کچھ نوجوان میڈیکل افسران کو حفاظتی ٹیکوں کے پروگرام کو

کامیاب بنانے کے لیے جوش وجذبے اور ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے دیکھا ہے۔ میں اس ملک سے اس بیماری کا خاتمہ دیکھنے کا منتظر ہوں۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ پاکستان پولیو کے خاتمے کی جنگ ہار گیا ہے۔

معین احمد اعوان نے ملک میں بڑھتے ہوئے خودکشی کے رجحان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ دماغی صحت کی لڑائیاں مشکل سے لڑی جانے والی لڑائیاں ہیں، جو اکثر پوشیدہ لیکن گہری تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ پاکستان میں ۴۵ ملین سے زیادہ لوگ ذہنی امراض جیسے ڈپریشن اور پریشانی کا شکار ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ ایسے اقدامات سے اپنی جان گنوا بیٹھے ہیں۔ ایک معاشرے کے طور پر، ہمیں احتیاط اور ہمدردی کے ساتھ لوگوں کو سننا سیکھنا چاہیے۔ ان مصیبتوں کو فیصلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں ان کی بات سننے اور ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔ اسکولوں، خاندانوں اور کمیونٹیز کو محفوظ جگہیں بنانے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے جہاں افراد بغیر کسی خوف کے اپنا درد بانٹ سکیں۔ دماغی صحت سے متعلق آگاہی ایک اہم امر ہے۔ دماغی صحت کے مسائل کو نظر انداز کرنے سے جانیں ضائع ہو سکتی ہیں۔ آیئے خاموشی کو توڑ کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائیں کہ کوئی بھی ان لوگوں کو اس لڑائی میں تنہا محسوس نہ کروائے اور ان کی بات کا احترام کریں۔

ملک محمد شاہویز اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کو کینسر کے علاج کے حوالے سے ایک اہم چیلنج کا سامنا ہے۔ فی الحال، ضلع میں کینسر کے لیے مخصوص ہسپتال نہیں ہے، جس کی وجہ سے مریضوں کو مناسب دیکھ بھال کے لیے بڑے شہروں کا طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ خصوصی سہولیات کی یہ عدم موجودگی مریضوں اور ان کے اہل خانہ کے لیے مشکلات کا سبب بنتی ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو بار بار سفر یا مہنگے علاج کے متحمل نہیں ہوتے۔ اگرچہ عام ہسپتال، جیسے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر (DHQ) ہسپتال، صحت کی بنیادی خدمات فراہم کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس کینسر کی تشخیص اور علاج کے لیے درکار جدید آلات یا ماہرین نہیں ہیں۔ حالیہ برسوں میں، ڈیرہ غازی خان میں کینسر کے کیسز میں اضافہ ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے کینسر کے علاج کے مقامی مرکز کی ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جبکہ شہر میں ایک شوکت خانم لیبارٹری کلیکشن سینٹر ہے، یہ صرف ٹیسٹنگ اور نمونے جمع کرنے کی خدمات پیش کرتا ہے۔ کیموتھراپی، ریڈی ایشن اور سرجری جیسے علاج کے لیے مریضوں کو اب بھی لاہور، ملتان یا بہاولپور کے کینسر ہسپتالوں میں جانا پڑتا ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں کینسر ہسپتال کی کمی صحت کی دیکھ بھال کے بنیادی ڈھانچے میں ایک اہم خلا کو نمایاں کرتی ہے۔ کینسر کے مریضوں کو بروقت تشخیص اور مسلسل دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے، جو مقامی سہولت کے بغیر حاصل کرنا مشکل ہے۔

حکومت کی ناقص کارکردگی

محمد رفیق زکریا نے اپنے خط میں لکھا کہ میں سندھ حکومت کے متعلقہ حلقوں کی توجہ لیاری ایکسپریس وے کی ابتر حالت کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ پچھلے ہفتے میرا ایک دوست ہاکس بے سے اپنی فیملی کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ اس نے ماڑی پور سے لیاری ایکسپریس وے لیا اور ٹول چارجز ادا کرنے کے بعد وہ ۶۰ سے ۷۰ کے درمیان رفتار سے آگے بڑھا۔ تقریباً ۷ سال کا ایک بچہ اچانک ایکسپریس وے کے پار بھاگا کیونکہ لیاری ایکسپریس وے پر بچے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بچے کو بچانے کی کوشش میں، میرے دوست کی کار دوسری کار سے ٹکرا گئی۔ خوش قسمتی سے، میرا دوست، اس کی بیوی اور دو بچے محفوظ رہے لیکن اس کی گاڑی کو کافی نقصان پہنچا۔ جب سندھ حکومت ٹول چارجز لے رہی ہے تو ایکسپریس وے کی دیکھ بھال کیوں نہیں کر رہی؟ لیاری ایکسپریس وے پر سڑکوں پر سٹریٹ لائٹس نہیں ہیں۔ میں نے اکثر ایکسپریس وے پر موٹر سائیکلیں چلتی دیکھی ہیں جبکہ دو اور تین پہیوں پر مکمل پابندی ہے۔ مرکزی لیاری ایکسپریس وے پر بچے پتنگ اڑاتے اور کرکٹ کھیلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ جب لیاری ایکسپریس وے کا افتتاح کیا گیا تو پورے ایکسپریس وے کو دونوں طرف لوہے کی جالیوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام لوہے کے جال غائب ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں اور آوارہ جانوروں کو لیاری ایکسپریس وے پر قبضہ کرنے کی اجازت مل گئی ہے جہاں ٹریفک انتہائی تیز رفتاری سے چلتی ہے۔ مراسلہ نگار نے آخر میں حکومت سے سوال کیا کہ کیا سندھ حکومت کسی بڑے ٹریفک حادثے کا انتظار کر رہی ہے؟

'ڈان' میں قارئین کے خطوط کا صفحہ زیادہ ذمہ داری کا مظہر

بقا کی جدوجہد

شفقت حسین میمن نے لکھا کہ سندھ کے ضلع خیرپور میرس کی تحصیل گمبٹ میں یونین کونسل کھوہرہ نظر اندازی کی تلخ حقیقت سے لڑ رہی ہے۔ روزانہ ۱۳ سے ۱۵ گھنٹے تک بجلی اور گیس کی مسلسل بندش نے ضروریات زندگی کے حصول کو بھی ایک جاری جدوجہد بنا دیا ہے۔ خواتین غیر متناسب طور پر ان کمیوں کا خمیازہ برداشت کرتی ہیں، ان کی گھریلو ذمہ داریوں میں خلل پڑتا ہے۔ اور کاروبار جو پہلے ہی قبائلی تنازعات اور کمزور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی وجہ سے جدوجہد کر رہے ہیں مزید جمود میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ رہائشیوں نے ریلیف کے لیے سولر سسٹم اور گیس سلنڈرز کا رخ کیا ہے، لیکن اکثریت توانائی کی غربت میں پھنسے ہوئے ہیں، اور ان متبادلات کی لاگت کو برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ علاقے میں پبلک ٹرانسپورٹ بند ہو گئی ہے، جس سے رہائشی خیرپور یا سکھر جانے کے لیے گمبٹ بائی پاس جانے پر مجبور ہیں، اخراجات اور سفر کا وقت بڑھ رہا ہے۔ حالتِ زار میں اضافہ کرتے ہوئے، ناقابل بھروسہ موبائل نیٹ ورک طلباء، پیشہ ور افراد اور رہائشیوں سے رابطہ منقطع کر دیتے ہیں، اور اس طرح انتہائی اخراجات کے باوجود اہم خدمات تک رسائی یا ضروری کاموں کو مکمل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کئی رہائشی، برسوں کی نظر اندازی سے مایوس ہو کر، ہجرت پر مجبور محسوس کرتے ہیں، جب کہ دیگر پہلے ہی بہتر مواقع کی تلاش میں کہیں اور چلے گئے ہیں۔ یہ صورتحال فوری مداخلت کی متقاضی ہے۔ حکام کو لوڈ شیڈنگ کے قومی شیڈول کی پابندی کو یقینی بنانا، بجلی اور گیس کی مصنوعی بندش کو دور کرنا اور انفرااسٹرکچر اور ترقی کو بڑھانا چاہیے۔ موبائل نیٹ ورک فراہم کرنے والوں کو صارفین کو درپیش مشکلات کو کم کرتے ہوئے خدمات کو بہتر بنانا چاہیے۔

ڈجیٹلائزیشن

بنوں سے انور سیاب خان لکھتے ہیں کہ جیسے جیسے دنیا ڈیجیٹلائزیشن کی طرف بڑھ رہی ہے، پاکستان کی ترقی غیر یقینی دکھائی دے رہی ہے۔ ہمسایہ ملک بھارت سافٹ ویئر کی برآمدات سے سالانہ ۲۰۰ بلین ڈالر کماتا ہے، جب کہ پاکستان تقریباً ۳ء۲ بلین ڈالر کماتا ہے۔ حالیہ مہینوں میں حکومت کی طرف سے انٹرنیٹ کنکشن اور سوشل میڈیا تک رسائی کو محدود کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ پاکستان کی معیشت اس وقت قرضوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بلاشبہ ڈیجیٹل اسپیس کو محدود کرنا ان مسائل کو مزید بڑھا دے گا۔ حکومت کو سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر سخت کنٹرول رکھنے کے بجائے غربت، ناخواندگی، بے روزگاری، دہشت گردی اور موسمیاتی تبدیلی جیسے اہم خدشات کو دور کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ زیادہ ترقی پسند انداز اپنا کر پاکستان اپنی بے پناہ ڈیجیٹل صلاحیتوں کو کھول سکتا ہے۔

متفرق مسائل

اگر ہم حالیہ مسائل کی بات کریں تو محمد حسن عباسی نے یونیورسٹی روڈ پر کیے جانے والے تعمیراتی کام کی وجہ سے پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ٹریفک کے مسائل کو حل کرنے کے لیے لیاقت نیشنل ہسپتال، نیوٹاؤن، جیل چورنگی اور ایم اے جناح روڈ تک جانے والی رابطہ سڑکوں پر کام تیز کرنے کی ضرورت ہے اور حکام کو اس سلسلے میں فوری ایکشن کو یقینی بنانا چاہیے۔ صلاح الدین کاکڑ نے اپنے خط میں ایک عالمی مسئلے کو پاکستان کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گداگری پاکستان میں ایک منافع بخش کاروبار بن گیا ہے جو لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور اور اسلام آباد سمیت تمام بڑے شہروں تک پھیل چکا ہے۔ یہ جرائم پیشہ افراد پسماندہ علاقوں سے غریب، معذور اور نوجوان سمیت کمزور افراد کو پکڑ کر بھیک مانگنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر یا تمام کمائی ہینڈلرز کو دی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا کاروبار ہے جس پر ایک طاقتور مافیا کا کنٹرول ہے۔ مزید اپنا ذاتی تجربہ بتاتے ہوئے کہا کہ حال ہی میں ایک گلی میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کالی کار جو مختلف مقامات پر بچوں کو چھوڑنے کے لیے رک رہی ہے پھر تھوڑی دیر وہ بچے بھیک مانگنے لگے گئے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ بھی واضح تھا کہ ڈرائیور ایک منظم بھیک مانگنے والے نیٹ ورک کا حصہ تھا، جو ممکنہ طور پر بھیک مانگنے کے لیے ان بچوں کا استحصال کر رہا تھا۔ یہ افسوسناک حقیقت ہمارے معاشرے کے ایک بھیانک پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ ❁

تذکرہ کتابوں کا

خان ظفر افغانی 'تذکرہ کتابوں کا' میں اس بار مسلم معاشرت۔ فلاحی ریاست۔ پاکستان کے آئین سے متعلقہ کتابوں کے مندرجات پر بات کررہے ہیں۔ ساری کتابیں بہت اہم ہیں۔ ان پر تبصرہ یقیناً بہت احتیاط اور تدبّر کا طالب ہے۔ خان ظفر افغانی صاحبِ مطالعہ ہیں۔ کتابوں میں گھرے رہتے ہیں۔ کتابوں پر اظہارِ خیال ان کا ذوق بھی ہے شوق بھی۔ یہ تبصرے پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

''مسلم معاشرت کی سیاسی اور قانونی تشکیل''

چند اہم مباحث کا تاریخی جائزہ۔ از: محمد خالد مسعود

☆ خان ظفر افغانی

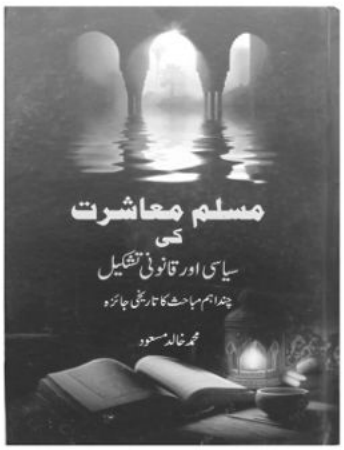

ڈاکٹر محمد خالد مسعود، مسلم معاشرت، اسلامی موضوعات اور علم فقہ پر تحقیق کے حوالے سے وطنِ عزیز میں اور بین الاقوامی سطح پر شہرت کے حامل ہیں۔ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ہونے کے علاوہ مختلف جامعات اور تحقیقی اداروں کے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کتنی ہی علمی و تحقیقی مجالس میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ملک میں اور بیرونِ ملک، معتبر تحقیقی و علمی مجلّوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

زیرِ تذکرہ کتاب بھی ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے اُن تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں تحریر کیے اور یہ ''ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی'' (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) کے مجلّے میں شائع ہوتے رہے۔

یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کا مرکزی نکتہ فقہ ہے۔ فقہ، سیرت، فقہ، تاریخ، فقہ، ولایت، فقہ، سیاست اور فقہ، احیا و تجدید کے عنوانات سے عہدِ نبویؐ کے چند مشروبات، فریضۂ حج میں استطاعت کی شرط کا مسئلہ، جزیرۂ قبرس میں اسلام کی سرگزشت، اسپین میں اسلام کی سرگزشت، اصولِ فقہ کی تاریخ پر ایک نظر، ولایتِ نکاح و اجبار، تاریخِ اسلام میں اہلِ حلّ و عقد کا تصوّر، برصغیر اور مسئلہ اجتہاد، قمری مہینے اور فلکیاتی حساب، مسلم اقلیتیں اور سیاسی معاشرت، وغیرہ پر تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ مضامین مسلم تاریخ، علم و تحقیق سے بھرپور ہیں۔ زبان اتنی عام فہم اور دل نشین ہے کہ ہمارا جیسا فقہ سے نابلد قاری بھی انہیں پڑھتے ہوئے کوفت یا بوجھ محسوس نہیں کرتا بلکہ دلچسپی سے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ مضامین اسلام اور مسلم تاریخ کے مختلف موضوعات اور ادوار کے بارے میں معلومات کا خزانہ ہیں۔ فقہ، اسلام اور مسلم تاریخ کے طلباء اور ہمارے جیسے عام قارئین کے لیے ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ لازم مطالعہ ہے۔

تین سو چار صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ''ادارۂ فکرِ جدید'' (لاہور) نے ''ادارۂ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)'' کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت ہے بارہ سو روپے۔

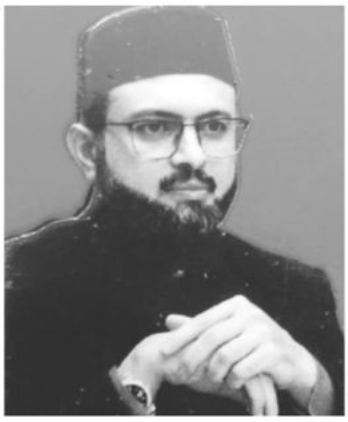

''دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کا تصوّر''

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی تحقیقی تصنیف

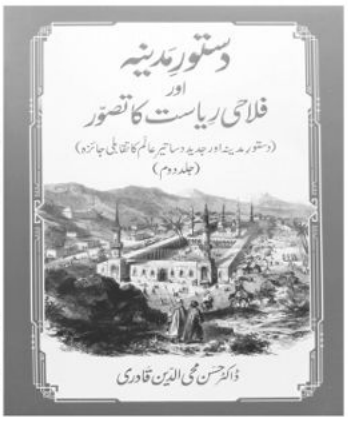

علم و تحقیق پہ مشتمل، یہ ضخیم کتاب معروف محقق ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی تصنیف کردہ ہے۔ پہلی جلد 742 اور دوسری جلد 629 صفحات پر محیط ہے۔ اس تحقیقی تصنیف کی تقریظات معروف مسلم محققین و اساتذہ پروفیسر

تذکرہ کتابوں کا

ڈاکٹر جمال فاروق جبریل محمود الدقاق (پرنسپل دعوہ اسلامیہ کالج قاہرہ، مصر) کی تحریر کردہ ہیں۔

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے اپنی اس وقیع تصنیف میں دستورِ مدینہ اور جدید دساتیز عالم کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے لاگریجویشن کیا۔ جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن لاہور سے سات سالہ علوم شریعہ (درسِ نظامی) کی تکمیل کی اور منہاج یونیورسٹی سے عربی اور علوم اسلامیہ میں ماسٹرز کیا۔ سٹی یونیورسٹی لندن سے مینجمنٹ سائنس میں ایم ایس سی کیا۔ سٹی یونیورسٹی لندن کی کاس بزنس اسکول سے آرگنائزیشن بی ہیویئر اینڈ ڈیولپمنٹ میں تخصص کیا۔ انہوں نے بیرون ملک جامعات سے مختلف موضوعات پر کورسز بھی کیے ہیں۔ انہوں نے کئی مسلم ممالک کے معروف علماء ومشائخ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔

حسن محی الدین قادری نے اسلامی (دستورِ مدینہ) اور مغربی دساتیر کے تقابلی جائزے پر تحقیقی مقالہ تحریر کر کے مصر کی ''جامعۃ الاول العربیۃ (عرب لیگ یونیورسٹی) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے لیے یہ بھی قابل فخر ہے کہ وہ مسلم دنیا کی معروف شخصیت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے بیٹے ہیں۔

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں دستورِ مدینہ کا کامل جائزہ، تقابل وتوضیح اور تشریح کی ہے اور مغربی دساتیز سے تقابلی جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ وقیع، تاریخی، اہم مقالہ اُردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو، عربی اور انگریزی پر ان کی تقریباً بارہ کتب اُردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اتنی ہی زیر طبع ہیں۔

دستورِ مدینہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تشکیل وتدوین، ذرائع آمدن اور جدید ریاستوں کے ذرائع آمدن کا موازنہ، انتظامی اداروں کی تفصیل، شہریت کے اصول، عالمی سفارتی تعلقات، ملکی دفاع کی پالیسی، حقوقِ انسانی، عورتوں کے حقوق، آزادئ اظہار رائے، قصاص وانصاف کے اصول، اختیارات کی تقسیم، ریاست کے تمام اداروں کے فرائض واختیارات اور دیگر امور کا نہایت تفصیلی جائزہ نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا۔

''دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کا تصوّر'' اتنی تفصیل کے ساتھ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کا مکمل ذکر اس تذکرے میں ممکن نہیں۔ ہم نے چند نکات یہاں پیش کیے ہیں۔ یہ مقالہ ایک نہایت قابل قدر دستاویز ہے جو تحقیق کے طلبا کے لیے اور دستورِ مدینہ اور جدید ریاستوں کے دساتیر کے تقابل کے مطالعے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے انتہائی مفید ہے۔

یہ کتاب بڑے سائز، اعلیٰ قسم کے کاغذ، مضبوط جلدوں کے ساتھ ''منہاج القرآن پرنٹرز'' (لاہور) نے شائع کی ہے۔ اس کی دونوں جلدوں کی قیمت چار ہزار پانچ سو روپے ہے۔

''آئینِ پاکستان 1973 اور اسلام''

مارشل لاء، عدلیہ اور پارلیمان کا کردار

ڈاکٹر شہزاد احسن اقبال شام کی تصنیف

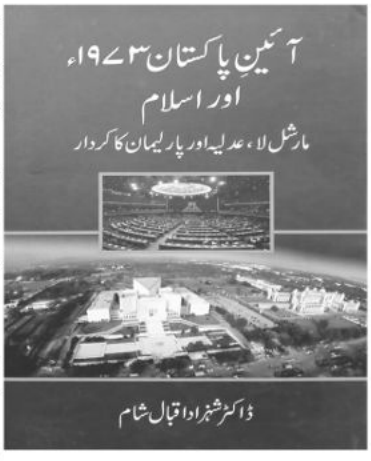

ڈاکٹر شہزاد اقبال شام نے دستوری مباحث ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کی ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ان کی مادرِ علمی ہے۔ جہاں سے انہوں نے شریعت اور قانون کا علم حاصل کرنے کے بعد اسی میں تقریباً تین عشروں تک تدریسی وتحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ اب وہ ''انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز'' سے بحیثیت ریسرچ فیلو وابستہ ہیں۔

زیر تذکرہ یہ کتاب اسی انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین خالد رحمن نے پیش لفظ تحریر کیا ہے کہ ''ڈاکٹر شہزاد اقبال شام نے سب سے پہلی تو قراردادِ مقاصد کے حوالے سے گزشتہ 70 سال کے عرصے میں ہونے والے پارلیمانی اور عدالتی مباحث کا اس طرح عام فہم انداز میں تجزیہ کر دیا ہے کہ دستوری اور قانونی پیچیدگیوں کو نہ سمجھنے والے قارئین بھی اس سے بہ آسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں دستور سازی کے لیے وضع کردہ اس بنیادی دستاویز کے تناظر میں اس کی ساتھ ہی دستور میں ہونے والی ہر ترمیم کا پس منظر، اس سے متعلق مختلف اداروں اور شخصیات کا کردار اور اس حوالے سے دستور کے اسلامی مشتملات پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ کتاب میں موجود ہے۔ اس طرح یہ کتاب بیک وقت دستور وقانون اور سیاسیات کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے پاکستان کی سیاسی وآئینی تاریخ کا بھی کسی قدر احاطہ کر لیتی ہے۔''

تذکرہ کتابوں کا

مصنّف نے 26 صفحات پر مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں موضوع کا تعارف اور اہمیت بیان کرتے ہوئے دستور کی اسلامی شقوں پر اثر انداز اداروں، قراردادِ مقاصد اور دستور پاکستان، اصول فقہ اور عدالتی فیصلوں، دستور، مسلح افواج اور عدلیہ کی مثلث، دستور شکنی و دستوری انحراف کے تدارک اور دیگر معاملات کا جائزہ لیا ہے۔

کتاب سات ابواب اور 428 صفحات پہ مشتمل ہے۔ ان ابواب میں مثالی اسلامی دستور معاصر کی نظر میں، قراردادِ مقاصد، شارعین اور عدلیہ، قراردادِ مقاصد پر سپریم کورٹ کے فیصلے کا محاکمہ، دستور پر مارشل لا 1977 کے اثرات، دستور کی اسلامی دفعات اور 1999 کی فوجی حکومت، دستور کی اسلامی دفعات میں پارلیمانی ترامیم، دستورِ پاکستان کل، آج اور کل کے عنوانات کے ضمن میں اسلامی فکر، ریاست کے مذہب، پاکستان کے دساتیر میں قراردادِ مقاصد کے ذکر، اسلامی نظریاتی کونسل، آئینی ترامیم، مردم شماری، مارشل لاء و پارلیمانی اسالیب اور دیگر متعلقہ امور کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے پس ورق پر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس احمد، معروف سینیٹر راجہ محمد ظفر الحق کی آراء پیش کی گئی ہیں۔

پاکستان کے 1973 کے آئین اور اسلام کے قوانین کے حوالے سے یہ تصنیف معلومات کا خزانہ ہے جو ساتھ ہی پاکستان کی دستوری تاریخ بھی ہے۔

اس کتاب کی قیمت ہزار روپے ہے۔

''قیامِ امن اور اقوام عالم''

طٰہٰ قریشی کی تصنیف

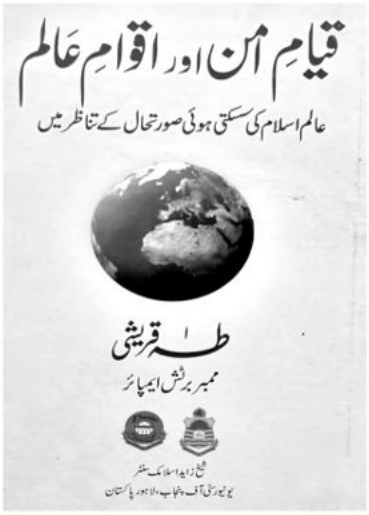

یہ کتاب ''قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل (لاہور) کے زیر اہتمام طبع ہوئی ہے۔ جس کے چیف ایگزیکٹو عبدالستار عاصم ہیں۔ انہوں نے ہی کتاب کے آغاز میں مصنّف کا تعارف پیش کیا ہے کہ ''طٰہٰ قریشی' ملکہ برطانیہ کی طرف سے ایوارڈ یافتہ 'ممبر برٹش ایمپائر' ہیں اور برطانوی ایوانوں و پالیسی ساز اداروں میں متاثر کن اثر و رسوخ رکھنے والے ایک صاحب علم و دانش 'برٹش پاکستانی مسلم' کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ تعلیمی میدان میں وسیع خدمات، انتہا پسندی کے خاتمے، بین الاقوامی تعلقات میں بہتری، بین المذاہب ہم آہنگی اور قیامِ امن کے لیے ان کی انتھک کوششوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔''

کتاب کا تعارف، شیخ زید اسلامک سینٹر یونیورسٹی آف پنجاب (لاہور) کے پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق گوندل کے الفاظ میں کہ ''طٰہٰ قریشی نے اسلام اور پاکستان کے حوالے سے پورے اعتماد اور ناقابل تردید اعداد و شمار کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ مغرب نے اپنے اقتدار اور میڈیا کو استعمال کر کے عالمِ اسلام میں دہشت گردی اور جس انتہا پسندی کی افزائش کی، وہ آگ اب بے گناہ مسلمان معاشروں کو جلانے کے بعد مغربی سماج ہی نہیں پورے عالم کے امن کے لیے خطرہ بن چکی ہے۔ مصنّف نے جن رپورٹس، دستاویزات اور کتب و رسائل سے حوالہ جات دیے ہیں ان کو تحقیقی اعتبار سے چیلنج کرنا بہت مشکل ہے۔ دلائل وزنی ہیں اور اسلوب اتنا عادلانہ کہ اکیسویں صدی میں کسی بھی معاشرے یا مذہب سے تعلق رکھنے والا انسان، قریشی صاحب کے تجزیے سے اتفاق ہی کرے گا۔ یہ کتاب اہلِ علم و دانش اور بین الاقوامی امور کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔''

یہ کتاب 251 صفحات اور پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنّف نے سوشلزم، کمیونزم اور کیپٹلزم نظاموں، غیر مسلموں کی دہشت گردی، ہولوکاسٹ، مسلم ممالک پر غیر ملکی افواج کی یلغار اور اس کے منفی نتائج، پاکستان کی نظریاتی اساس، قرار داد مقاصد، دوقومی نظریہ، قرآن اور اسلامی دستور، انتہا پسندی اور دہشت گردی کی حقیقت و اسباب، مغرب کا تصورِ جہاد اور حقیقت جہاد، مسئلہ کشمیر حقائق کے تناظر میں، مسئلہ فلسطین، موجودہ عالمی انتشار پر اسلامی نقطۂ نظر اور دیگر امور کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے ٹھوس حقائق اور دلائل دیے ہیں۔

مصنّف جن کا پورا نام طٰہٰ بشیر ذوالقرنین قریشی ہے، کا کہنا ہے کہ ''اس کتاب میں میرے مخاطب پوری دنیا کے لوگ بالعموم اور ملت ابراہیمی سے تعلق رکھنے والے تینوں طبقات یہودی، عیسائی اور مسلمان بالخصوص ہیں۔''

کتاب کے فلیپ محمد رفیق رجوانہ ایڈووکیٹ، گورنر پنجاب (اب سابق)، رفاہ یونیورسٹی انٹرنیشنل اسلام آباد کے بانی چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد اور ڈاکٹر اجمل خان نیازی نے تحریر کیے ہیں۔ کتاب کے پس ورق پر معروف صحافی مجیب الرحمن شامی کی رائے درج کی گئی ہے۔

زیر تذکرہ کتاب کی یہ چوتھی اشاعت ہے اور اس کی قیمت ہے ڈھائی ہزار روپے۔ اس کی اشاعت شیخ زاید اسلامک سینٹر کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ ❁

'خاموش دستک' کا تعارف

سعیدہ افضل 'اطراف' کی قلمی سرپرست ہیں۔ بہت دلچسپی سے 'اطراف' کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ہمیں قیمتی مشوروں سے نوازتی ہیں۔ اپنی آپ بیتی کے علاوہ بھی ان سے عرض کی گئی تھی کہ وہ وقت نکال کر کچھ اور موضوعات پر بھی اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں لکھیں۔ کینیڈا میں مقیم جناب حبیب شیخ کے افسانوں کے پہلے مجموعے پر ان کا اظہار خیال ملاحظہ کیجئے۔

'خاموش دستک' سے حبیب شیخ نے اپنا سکوت توڑا ہے

تعارف: سعیدہ افضل

حبیب شیخ صاحب (مقیم کینیڈا) کا افسانوں کا پہلا مجموعہ حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ تمام کتاب کو ایک ہی نشست میں مکمل پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ دستک خاموش تو ہے مگر خاموش نہیں ہے۔ کیونکہ خاموشی کی اپنی زبان ہوتی ہے یہ گونگی بہری نہیں ہوتی۔ خاموشی باتیں بھی کرتی ہے مگر صرف ذکر و فکر کرنے والوں کے ساتھ۔

خاموش دستک سے مصنف نے پہلی بار ادب میں اپنے سکوت کو توڑا ہے اور دستک سننے والوں کو حیران کر دیا ہے۔ بقول خود حبیب صاحب۔ جو چنگاری لڑکپن سے ان کے اندر چھپی بیٹھی تھی اس نے چنگاری سے شعلے بننے کا سفر تخلیق کے اس کرب کو سہنے کے بعد طے کیا ہے۔ جو ہر تخلیق کار کو سہنا پڑتا ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع انسان اور انسان سے محبت ہے تبھی انہوں نے اپنے افسانے کے مجموعے خاموش دستک کا انتساب محبت بانٹنے والی مخلوقات کے نام کیا ہے۔ اپنے تمام افسانوں میں معاشرے کی خرابیوں اور ناانصافیوں کو اجاگر کرنے میں وہ کامیاب رہے ہیں جبر و استبداد کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ اس استحصالی معاشرے میں صرف اپنے دکھوں کے بارے میں بے بسی سے سوچ سکتے ہیں۔ وہ کہیں بھی تخیلاتی اور ماورائی نہیں ہیں یہ کردار ہمارے درمیان سانس لیتے ہوئے زندہ، چلتے پھرتے اور کراہتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب کتاب حقیقت پسند ادیب ہیں اور مختصر نویسی کا ایسا ہنر جانتے ہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

افسانوں کا موضوع
انسان اور انسان سے محبت

مختصر نویسی۔ سادہ زبان۔
جبر تلے دبے کردار

حلقۂ اربابِ تخلیق کے زیر اہتمام کینیڈا سے آئے ہوئے مصروف افسانہ نگار جناب حبیب شیخ کے افسانوی مجموعے ''خاموش دستک'' کی تقریب رونمائی 15 دسمبر بروز اتوار منعقد ہوئی، صدارت رحمن نشاط صاحب، جبکہ فرائض مہمان خصوصی جناب رفیع مصطفی (مشہور افسانہ نگار و ادیب مقیم کینیڈا) اور جناب فراست رضوی نے ادا کیے۔ تلاوتِ کلام پاک کی سعادت فراست رضوی صاحب نے پائی۔ نظامت کے فرائض جنرل سیکرٹری جناب حامد اسلام خان اور سرپرست اعلیٰ حلقۂ ارباب تخلیق جناب طارق جمیل نے ادا کیے۔ اقبال راجہ صاحب اور سعیدہ افضل نے کتاب کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ کینیڈا میں نعیم اشرف کا لکھا ہوا تبصرہ محمد زبیر طاہر نے پیش کیا۔ میڈیا کوآرڈینیٹر زبیر طاہر نے پروگرام کو فیس بک پر لائیو ٹیلی کاسٹ کیا۔

(کتاب آواز پبلی کیشنز۔ اقبال مارکیٹ کمیٹی چوک راولپنڈی سے فون 0300-5211201 پر رابطہ کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔)

رقص یعنی۔ معنویت کا رقص

”’رقص یعنی‘۔اردو شاعری میں ایک منفرد تجربہ ہے۔ایک بحر۔ایک ردیف۔51غزلیں۔ہر غزل کے ساتھ رنگین مصوری۔اردو شاعری کے دلدادگان میں بہت پسند کی جارہی ہے۔اردو شاعری۔تنقید کے ممتاز اساتذہ میں ڈاکٹر پروفیسر شاداب احسانی ایک محترم مقام رکھتے ہیں۔شاعری میں ان کا اپنا اسلوب ہے۔تنقید اور تدریس میں بھی انفرادیت۔وہ عالمی تنقید کے تناظر میں بار بار کہتے ہیں کہ پاکستان کا اپنا بیانیہ ہونا چاہئے۔’رقص یعنی‘ پر ان کی خصوصی تحریر اس وقت ادبی حلقوں میں موضوع سخن ہے۔اس کا پورا متن ’اطراف‘ کے قارئین کی نذر ہے۔“

معنویت کا فروغ۔ ”رقص یعنی“ اس سلسلے کی کڑی

استاد الاساتذہ۔ پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی کی کرم فرمائی

معنویت کا رقص/ رقص یعنی

پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی

معلوم دنیا میں تا حال ہزار ہا اجتماعی شعور کی رنگارنگی یا بوقلمونی تہہ در تہہ مناظر و مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جب اجتماعی شعور مصلحتوں، منافقتوں اور مناصب کے زیر اثر ہو جاتا ہے تو پھر انفرادی شعور کے ذریعے اجتماعی شعور کو نہ صرف نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ علم کی ہر جہت کو کام میں لا کر صاحبان علوم اپنی اپنی سطح پر کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ پچھلی دہائیوں میں گوتم، کنفیوشس، زرتشت اور بعد ازاں یونانی مفکرین!!

اس ضمن میں شاعری کو تفوق حاصل تھا، حاصل ہے اور حاصل رہے گا۔ اجتماعی شعور کے ضمن میں اوّل الہام، دوئم القا اور سوئم عشق۔ ان تینوں صیغوں میں الہام کے حوالے سے جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب اجتماعی شعور کے خلاف تھے وہ اجتماعی شعور کہ جو بندگانِ خدا کے لیے اپنی افادیت کھو چکا تھا، ہر ایک پیغمبر انفرادی شعور کے ذریعے اجتماعی شعور کا نصاب مرتب کرتا نظر آتا ہے، یہی کام القا کے ذریعے درویش نے کیا۔ عشق لاشریک کی طرف گامزن رہا۔ وجدان کے ذریعے شاعرانہ بصیرت نے لفظ و معنی کو عصر سے جوڑنے کا لازوال کام کیا، یہی کام شاعر کی فضیلت قرار پایا کہ شاعر ایسا لغت نویس ہے کہ نئے نئے الفاظ نہ صرف وضع کرتا ہے بلکہ معنویت کے فروغ میں بھی نمایاں حصہ دار ہوتا ہے۔ ”رقص یعنی“ کو بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔

ہر غزل کے کلیدی شعر پر ایک رنگین تصویر

”رقص یعنی“ ایسا شعری مجموعہ ہے کہ اس سے قبل ایسی کوئی مثال موجود نہیں۔ رقص یعنی سے فوراً ناٹیہ شاستر کی طرف ذہن چل پڑتا ہے۔ جب اجتماعی شعور رشتہ من و تو سے رشتہ خود غرضی میں مبتلا ہو جاتا ہے نتیجتاً اشرافیہ کے اختیارات کے زیر اثر آجاتا ہے یوں انفرادی شعور عوام الناس سے مکالمہ کرنے لگتا ہے۔

توڑ دیتی ہے اندھیروں کا حصار
اک مری سوچ کی مشعل یعنی

اس ”یعنی“ میں معنویت کا ایسا طلسم ہے کہ بلیک ہول، گلیکسی میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ اگر ہم فکری سطح پر مذکورہ ”یعنی“ کو پینٹ کریں تو شاعرانہ بصیرت جگ مگ جگ مگ کرتی نظر آئے گی۔

طاہر سردھنوی کی شاگردی نے شاعرانہ روش اختیار کرنے کا حوصلہ دیا

انسانی زندگی روح اور جسم کا مرکب ہے جب کہ اس کی جائے اقامت مابعد طبعی اور طبعی جہانوں پر مشتمل ہے۔ یوں زندگی رشتے ناطوں کی تقسیم کا احوال ہے۔ جب تک محبت بنیاد رہتی ہے فکر و نظر کا چراغاں راہ کا تعین کرتا ہے۔

”رقص یعنی“ اکیاون غزلوں پر مشتمل مجموعہ ہے جس کی مقداری کیفیت کچھ یوں ہے۔

صفحہ نمبر	تعداد اشعار	قافیہ	مقطع	غزل نمبر
33	9	کرنا/ اترنا	✓	1
36	8	شامل/ دل دل	ندارد	2
39	8	اکثر/ برابر	✓	3
42	8	جاناں/ عنواں	ندارد	4
45	8	کم کم/ عالم	✓	5
48	7	نشانی/ سہانی	✓	6
51	7	تکلم/ گم	ندارد	7
54	7	جھلیں/ پی لیں	ندارد	8
57	8	چاہیں/ باہیں	ندارد	9
60	7	بن/ گن	ندارد	10
63	8	مائیں/ دعائیں	ندارد	11
66	6	توقف/ تعارف	✓	12
69	9/ تین مطلع	بابت/ حکایت	ندارد	13

72	7	تسکیں/ رنگیں	ندارد	14
75	7	راتیں/ باتیں	ندارد	15
78	8	چٹانیں/ ستانیں	ندارد	16
81	7	ضروری/ ادھوری	ندارد	17
84	7	مقصد/ آمد	ندارد	18
87	4	کھلنے ملنے	ندارد	19
90	5	رہنا/ کہنا	ندارد	20
93	7	وہی/ لگی	ندارد	21
96	7	افسوں/ زبوں	ندارد	22
99	7	خرابی/ شتابی	ندارد	23
102	7	کہاں/ گماں	ندارد	24
105	7	کنول ہے/ عمل ہے	ندارد	25
108	7	سہانا/ بہانا	ندارد	26
111	7	جام/ شام	ندارد	27
114	7	جتنا/ متقی	ندارد	28
117	8	سادہ/ ارادہ	✓	29
120	7	بارش/ خواہش	ندارد	30
123	7	گزاریں/ اتاریں	ندارد	31
126	7	دھندلکے/ سنبھل کے	ندارد	32
129	7	نکالی/ سوالی	ندارد	33
132	6	قائم/ نادم	ندارد	34
135	7	گزاری/ بھاری	ندارد	35
138	7	تصور/ تحیر	ندارد	36
141	8	قیامت/ سلامت (دوبار)	ندارد	37
143	7	اپنا/ تڑپنا	ندارد	38
146	7	چھنا چھن/ آنگن	ندارد	39
149	8	پرانے/ ٹھکانے	ندارد	40
152	8	پل پل/ مکمل	ندارد	41
155	8	بسالے/ حوالے	ندارد	42
158	7	ناکس/ بس	ندارد	43
161	7	سُو/ ہُو	ندارد	44
164	7	اُچھالا/ پالا	ندارد	45
167	7	ہوا/ بنا (دو مطلع)	ندارد	46
170	7	عام/ شام	ندارد	47
173	7	مہورت/ صورت (تین بار)	ندارد	48
177	6	ہری/ بھری	ندارد	49
180	6	ٹن/ تعین	ندارد	50
183	7	جہاں/ جواں	ندارد	51
میزانیہ			ندارد	
	کل اشعار 364 ایک غزل 3 مطلع ایک غزل 2 مطلع	قافیے قیامت سلامت دوبار مہورت صورت تین بار	مقطع 6	

ان غزلوں کی بحر رمل مسدس مخبون محذوف مقصور ہے۔ جس کا وزن فاعلاتن فعلاتن فعلن/ فعلان ہے۔ غالب کی مشہور غزل

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فریاد آیا

محمود شام۔ صحافت میں اظہار کی اعلیٰ ترین مثال۔ شاعری۔ بیان و بدیع کے نت نئے زاویے

بھی اسی بحر میں ہے۔ اس مجموعہ کی ہر غزل کے کلیدی شعر پر تصویر بھی اپنے ہونے کا اعلان کرتی نظر آتی ہے۔

محمود شام اردو صحافت کی ایسی نمایاں ہستی ہیں کہ جن کا اوڑھنا بچھونا پاکستان ہے۔ طاہر سردھنوی کی شاگردی نے انھیں شاعرانہ روش اختیار کرنے کا حوصلہ دیا۔

پھول پھر سے لگے کھلنے یعنی
لوگ پھر سے لگے ملنے یعنی
شہر میں ایسی چلی تازہ ہوا
زخم پھر سے لگے سلنے یعنی
ذہن کی بات پہ کچھ دھیان نہ دے
کر جو بولا ترے دل نے یعنی
آتے رہتے ہیں بلاوے کتنے
عشق دیتا نہیں ہلنے یعنی

یعنی کہیں زیرِ لب۔ کہیں برملا۔ کہیں عشق کا وسیلہ

یہ غزلیں معنویت کا رقص ہیں۔ معنویت کے رقص کی بات کریں تو شام صاحب نے علم البیان کو عصر سے آراستہ کر دیا ہے جس سے مزید لطف میں اضافہ ہوا ہے جہاں سچ نہ بولا جاتا ہو وہاں معنویت اسی طرح رقصاں ہو جاتی ہے۔ عشق ذات سے ذات کے تعلق کا نام ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

رقص میں ایک توقف یعنی
عشق مانگے ہے تعارف یعنی
شامؔ ہے جانِ غزل صرفِ ردیف
قافیے ایک تکلف یعنی

رقص ہر بار نیا ہوتا ہے
گیت ہو چاہے پرانا یعنی

یونہی اڑتا رہا آنچل تیرا
یونہی بندھتی رہی ڈھارس یعنی

لوگ چھپ جاتے ہیں اپنے گھر میں
اب یہ اندازِ فغاں ہے یعنی
اب تو ہر چوک میں بے چینی ہے
اب کہاں کوئی اماں ہے یعنی

محمود شام کی صحافیانہ روش اکھرے اظہار کی اعلیٰ ترین مثال ہے جب کہ شاعرانہ روش بیان و بدیع کے نت نئے زاویوں کا کمال ہے۔ قحط الرجال کے اس زمانے میں سچ کو شعار بنانا" ایسا آساں نہیں لہو رونا" کے مصداق ہے۔ ہم یورپی ادب کو ان کی آمرانہ سلطنتوں کے تناظر میں دیکھیں تو سچ کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لیا گیا۔ اس زمانے میں یہی کچھ پاکستان کی صورتحال ہے لہذا ''رقص یعنی'' معنویت کا وہ رقص ہے کہ جس میں "یعنی" نے کہیں زیرلب ، کہیں برملا اور کہیں عشق کے وسیلے سے رشتۂ من و تو کو اجاگر کیا ہے۔ جیسے سرمد نے عشق کو تلوار کی طرح عہدِ جبر کے لیے استعمال کیا۔ شام صاحب بھی سچے عشاق کی فہرست میں شامل ہو کر انفرادی شعور سے وہ کام لیتے نظر آتے ہیں کہ جو درویشوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ ترقی پسند محمود شام ادب برائے زندگی کے رقص میں مبتلا ہیں۔ حق بات کہنے کی پاداش میں رسالہ ''معیار" کا احوال ہمارے سامنے ہے۔

خوبروئی ہے جو پوشاک تری
خوش کلامی ترا گہنا یعنی
کہہ گئی موجِ صبا چپکے سے
ظلم ہے ظلم کو سہنا یعنی

معنویت کے رقص میں مبتلا محمود شام بحیثیت شاعر ہونے نہ ہونے کے احساس سے گزر چکے ہیں۔ "رقص یعنی" اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔

شادابؔ رقصِ یعنی کی دنیا میں زندہ ہوں
محمود شامؔ سے ہے بصیرت کی روشنی

"الخدمت پاکستان کی ایک قابل قدر ملک گیر تنظیم ہے۔ جو گرمی سردی میں رمضان المبارک میں راشن کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ گرم کپڑے لحاف بھی فراہم کرتی ہے۔ لیکن اس کا سب سے قابل تحسین پروگرام 'بنو قابل' ہے جو ذمہ داری تو ریاست کی ہے۔ مگر الخدمت اپنے طور پر ملک بھر سے نوجوانوں کو 3 ماہ سے ایک سال تک کی تربیت مہیا کر رہا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔"

بنو قابل۔ قوم کی تقدیر بدلنے والا پروگرام

تحریر: شعیب ہاشمی

دنیا کے پانچویں بڑے آبادی والے ملک پاکستان کو آج بھی خواندگی، بے روزگاری اور غربت جیسے سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ جہاں خواندگی کی شرح 62.8 فیصد ہے، دیہی علاقوں اور خواتین میں یہ شرح مزید کم ہے۔

30 سال سے کم عمر نوجوانوں پر مشتمل 64٪ آبادی کے لئے معاش کے مواقع انتہائی محدود ہیں۔ بے روزگاری اور غربت کے اثرات اس قدر زیادہ ہیں کہ والدین بچوں کو بنیادی تعلیم بھی نہیں دلا سکتے، جس کے باعث 6.2 کروڑ بچے سکول سے باہر ہیں جبکہ اعلیٰ تعلیم تک صرف 10٪ نوجوانوں کی رسائی ہے۔

آئی ٹی سیکٹر میں بے پناہ مواقع ہیں لیکن عدم توجہ، سہولتوں کی عدم

> 30 سال سے کم عمر نوجوانوں کے لیے انتہائی محدود روزگار

دستیابی سمیت دیگر وجوہ کے باعث باصلاحیت نوجوانوں کی صورت ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے اور اس کے باعث پاکستان کی آئی ٹی برآمدات صرف 6.2 بلین ڈالر ہیں جو خطے کے دیگر ممالک سے بہت کم ہیں۔

ایسے حالات کے پیش نظر الخدمت فاؤنڈیشن نے 2022 میں کراچی سے "بنو قابل" پروگرام کا آغاز کیا، جو نوجوانوں کو بااختیار بنانے اور پاکستان کی معیشت کو مضبوط بنانے کا ایک انقلابی اقدام تھا۔ بنو قابل محض ایک پروگرام نہیں بلکہ نوجوانوں کو تعلیم، ہنر، اور خود انحصاری کے ذریعے غربت اور بے روزگاری کی دلدل سے نکالنے کی کوششوں کا عزم

> آئی ٹی سیکٹر۔ بے حساب مواقع۔ لیکن توجہ نہیں

تھا۔ کراچی میں کامیابی کے بعد اس پروگرام کو لاہور، اسلام آباد، پشاور، اور ملک کے دیگر شہروں تک پھیلایا گیا اب اسے پورے پاکستان کے شہروں بالخصوص پسماندہ علاقوں میں شروع کرنے کے حوالے سے پلاننگ کے بعد عملدرآمد کا آغاز ہو چکا ہے۔

الخدمت بنو قابل پروگرام کا ہدف نوجوانوں کو جدید آئی ٹی سمیت دیگر کورسز کی مفت تربیت فراہم کر کے انہیں روزگار کے قابل بنانا ہے اس وقت الخدمت فاؤنڈیشن کے 200 سنٹرز میں 28 کورسز کروائے جا رہے ہیں جن میں ڈیجیٹل مارکیٹنگ، ویب ڈویلپمنٹ، فری لانسنگ، ای کامرس، اور دیگر آئی ٹی کورسز شامل ہیں۔ کورس مکمل ہونے کے بعد طلبہ وطالبات کو قومی و بین الاقوامی سطح کی اسناد فراہم کی جاتی ہیں، جو ان کے روزگار کے مواقع بڑھاتی ہیں۔

بے روزگاری کی شرح کو مدنظر رکھتے ہوئے بنو قابل پروگرام کے مقاصد میں آغاز سے ہی خود انحصاری کو پیش نظر رکھا گیا تا کہ نوجوان اس کورس کے بعد نہ صرف اپنے روزگار کا انتظام کر سکے بلکہ اپنے جیسے دیگر بے روزگار نوجوانوں کو بھی روزگار کی فراہمی کا ذریعہ بنیں۔ اس پروگرام کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ یہ صرف میل نوجوانوں کے لئے نہیں بلکہ اس میں فی میل کو بھی اتنے ہی مواقع حاصل ہیں، اب تک ان کورسز کی تکمیل کے بعد ہزاروں خواتین بھی گھریلو آمدنی میں اضافے اور اپنے گھرانے کو معاشی طور پر مستحکم کر چکی ہیں۔

ملک بھر میں 200 سے زائد بنو قابل سینٹرز قائم ہو چکے ہیں جن میں اضافہ ہو رہا ہے انٹری ٹیسٹ کے بعد منتخب طلبہ وطالبات کی انرولمنٹ کی جاتی ہے اور انھیں 3 ماہ سے 1 سال تک کے کورسز کروائے جاتے ہیں جن کے تمام اخراجات الخدمت فاؤنڈیشن برداشت کرتی ہے۔ طلباء

الخدمت 'بنو قابل'

کو یہ کورسز مکمل طور پر فری کروائے جاتے ہیں۔
کورسز کی تکمیل کے بعد طلبہ وطالبات کو عملی اقدامات کے ضمن میں بھی مکمل رہنمائی فراہم کی جاتی ہے نوجوانوں کو عالمی فری لانس مارکیٹ، آئی ٹی ماہرین، پاکستانی انڈسٹری ودیگر پلیٹ فارمز سے منسلک کیا جاتا ہے تاکہ ان کی آمدنی کا آغاز اور بتدریج اضافہ ہو۔ ہزاروں طلبہ یہ کورسز مکمل کر کے اپنے کاروبار کا آغاز یا جابز حاصل کر چکے ہیں، آئی ٹی ماہرین اور کمپنیز کو طلبہ سے منسلک کرنے

200 سے زائد 'بنو قابل' سینٹر۔
3 ماہ سے ایک سال تک کے کورسز

کے لیے ایک پورٹل بھی بنایا گیا ہے، جو روزگار کی فراہمی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ نوجوانوں کو روزگار اور معاشی استحکام ملنے سے نہ صرف ان کے گھرانوں کو فوائد حاصل ہو رہے ہیں بلکہ پاکستان کی معاشی ترقی اور غربت میں بھی کمی آ رہی ہے۔ بنو قابل نہ صرف بے روزگار نوجوانوں کے لیے امید کی کرن ہے بلکہ پاکستان کی معیشت کو مستحکم کرنے کی سمت ایک اہم قدم بھی ہے۔ یہ پروگرام پاکستان کی ترقی کی ایک واضح مثال بن چکا ہے، جہاں ہنر، تعلیم، اور عزم کے ذریعے غربت اور بے روزگاری کے چیلنجز کا سامنا کیا جا رہا ہے۔

الخدمت فاؤنڈیشن کا "بنو قابل" پروگرام ایک گیم چینجر ثابت ہو رہا ہے۔ یہ نہ صرف نوجوانوں کو خواب دیکھنے بلکہ ان خوابوں کو تعبیر میں بدلنے کی طاقت بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ کاوش واضح کرتی ہے کہ اگر تعلیم، مہارت، اور عزم کو یکجا کیا جائے تو پاکستان کو غربت اور پسماندگی سے نکال کر ایک مضبوط، خود کفیل، اور ترقی یافتہ ملک بنایا جا سکتا ہے۔ ❁

رائٹرز ہاؤس کے دس دن

اکادمی ادبیات پاکستان نے نئے لکھنے والوں کے لیے دس روزہ اقامتی پروگرام رکھا۔ نعیم یاد بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھے ان کی نظم فیس بک کے شکریے کے ساتھ۔

نعیم یاد، جوہر آباد، ضلع خوشاب

میں نے وہاں اپنے گزرے ہوئے دنوں کے نشان مٹانے کی کوشش کی ہے۔
میں نے وہاں کے کمرے کے دروازے پر لگے ہوئے نمبروں کو
دھندلا دیا،
اور اس خوبصورت منظر کے ہر کونے میں چھپے ہوئے لمحوں کو فراموش
کرنے کی ناکام کوشش کی،
لیکن پھر بھی اگر تم مجھے تلاش کرنا چاہو،
تو تمہیں ان الفاظ کی گونج سنائی دے گی،
جو ہر خیال میں پنہاں ہیں،
اور ہر دل کی گہرائی میں چھپے ہیں۔
جہاں بھی تخلیق کی روشنی پاؤ،
سمجھنا وہیں ہم ہیں،
کیونکہ یہ دراصل ہماری جڑیں ہیں،
جو کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت تمہیں مل جائیں گی۔

یہ جگہ ہماری نہیں،
بلکہ ہر لکھنے والے کی سرزمین ہے۔

اور ہر تحریر میں،
ہمیشہ کچھ نیا پیدا ہوتا رہے گا۔ ❁

ہفتہ وار سوال۔ 'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

ماہنامہ 'اطراف' کراچی کے پرنٹ اور ڈجیٹل کے امتزاج کے تجربے میں ماشا اللہ بہت پیش رفت ہو رہی ہے۔ ہر پیر کو ایک سوال۔ فیس بک۔ انسٹراگرام۔ واٹس ایپ۔ لنکڈان۔ اطراف اسپیشل۔ ویب سائٹ میں کیا جا رہا ہے۔ جمعرات کی رات 12 بجے تک جوابات وصول کیے جاتے ہیں۔ جمعہ کی رات کو دلکش رنگوں اور ڈجیٹل ڈیزائنوں میں 'اطراف' نوازوں (Followers) کی قیمتی آرا اور تجاویز۔ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارموں پر آویزاں کر دی جاتی ہیں۔ ان رپورٹوں پر بھی ہمارے کرم فرما مزید تبصرے کر رہے ہیں۔ ہر مہینے یہ ہفتہ وار سوال کا سلسلہ 'اطراف' پرنٹ میں بھی نذر قارئین کیا جائے گا۔ پڑھ کر آپ بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ ہفتہ وار سوال بھی آپ تجویز کر سکتے ہیں۔ یہ سوالات پاکستانی سماج کو سنوارنے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ انشا اللہ 'اطراف' اس طرح نئی پرانی نسل کو قریب لا کر ایک مستحکم معاشرہ قائم کر سکے گا۔

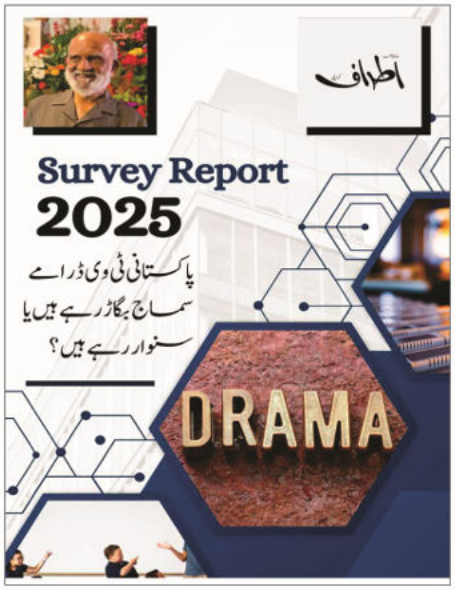

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

رضوان زیدی

بگڑے ہوئے سماج کو ڈرامے سدھار سکتے ہیں؟

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

تبسم ملیح آبادی

ایک زمانہ تھا جب پی ٹی وی کے ڈرامے معاشرتی و تہذیبی تربیت کے حامل تھے۔ مگر اب افراط و تفریط کے دور میں جہاں بے شمار ٹی وی چینل ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ریٹنگ کی دوڑ میں شطر بے مہار ہو چکے ہیں، بہت ہی مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی کوئی ڈرامہ معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتا ہو البتہ سٹیٹس بلند دکھا دکھا کر پست اور افلاس زدہ، محروم اور کچلے ہوئے، لوگوں کو ذہنی طور پر مزید انتشار میں مبتلا کر رہے ہیں اور محرومیوں سے دوچار کر رہے ہیں۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

شمیم شمسی

حال یہ ہے کہ جب بچے، جوان ہوں یا نابالغ، اپنے ہوں یا غیر کے ، ڈرامہ نشر ہو رہا ہو اور ان میں سے کوئی کمرے میں داخل ہو جائے تو آپ غیر ارادی طور پر اور کبھی دوسرے سے فرمائش کرکے اور کبھی دوسرے کی فرمائش پر ٹی وی بند کر دیں۔ شاید سماجی قدریں بدل رہی ہیں! یا ہم اپنے آپ کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں یا انکاری ہیں یا اس کو ہی نسلی تفاوت کہنا چاہیے۔ یا اس فرق کا فروغ کسی ایجنڈے کا تسلسل ہے اور ہمارے بیشتر ٹی وی ڈرامے اس کا ذریعہ بن رہے ہیں، کچھ کاروباری مجبوریوں کی وجہ سے اور کچھ دیگر مجبوریوں سے۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

صوفی راؤ جاوید اختر

پتہ نہیں ڈراما کی کہانی کہاں سے اخذ کی جاتی ہے ایسی کہانی 80 فیصد گھرانوں سے مطابقت نہیں رکھتی بھکڑ پن بیہودہ ذو معنی سیکس کو ابھارنے والے جملے طلاق اور حلالہ جیسے حساس معاملات ہر ڈرامے میں ساس بہو نند کی لڑائیاں دیور بھابھی کی بے تکلفی۔ کیا رائٹر فکری بانجھ پن کا شکار ہیں یا بیرونی N G Os اپنا کھیل کھیل رہی ہیں مقصد عریانی کا فروغ اور خاندان کا شیرازہ بکھیرنا ہے۔ اتوار کی دوپہر کو شام صاحب کی ترغیب پر خاندان کو اکٹھا کرتے ہیں شام کا ڈراما کرے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

فاروق احمد

ڈرامے نہ سدھار سکتے ہیں نہ بگاڑ۔ سدھارنے بگاڑنے کا کام گھر اور اسکول میں ہوا کرتا ھے۔ تربیت کا ہمارے ہاں رواج نہیں ہے پروگرامنگ کا ھے۔ ہم۔ بچوں کو صالح بنانے کے نام پر شدت پسند بناتے ہیں اور یہ کام جماعت اسلامی ٹائپ ذہنیت جس میں ہوتا معاشرہ غیر شعوری طور پر دو سو سال سے مبتلا ھے بخوبی انجام دے رہی ہے۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

تسنیم منظور علی

موجودہ ٹی وی ڈرامے ہم دیکھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ اکثر ڈرامے اچھے نہیں ہیں جبکہ پہلے ڈرامے اچھے ہوتے تھے جیسے فاطمہ ثریا بجیا کے ڈرامے جس میں تہزیب ہوتی تھی بڑوں کا احترام ہوتا تھا ایک خاندان اور رشتے داری دکھائی دیتی تھی حسینہ معین انور مقصود ان کے ڈرامے ہر طرح سے بہترین ہوتے تھے لیکن اب اکثر ڈراموں میں لباس بھی بیہودہ ہوتے ہیں اور اس کا اثر نو عمر لڑکیوں اور لڑکوں پر اچھا نہیں ہوتا۔

پاکستانی ٹی وی ڈرامے سماج
بگاڑ رہے ہیں یا سنوار رہے ہیں؟

عبدالرؤف ابراہیم

دیکھا اور سمجھا جائے تو کہانی سے لیکر اسکرپٹ رائیٹر تک سارا مواد ہمارے ارد گرد معاشرتی واقعات سے اخذ کیا ہوا مواد ہوتا ھے، جسے ڈرامہ یا فلم اداکار اپنے میک اپ، کاسٹیوم وغیرہ بحقیقت سے قریب اداکاری سے حقیقت کا روپ بھرتے ہیں۔ باقی ہمارا مادیت سے مکمل انسپائیرڈ معاشرے نے مادیت کی چاہ میں کونسی اخلاقی کمی کی ھے، جو ٹی وی ڈرامے انکو بگاڑ یا سنوار رہے ہیں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

محمد فیصل عشرت

آج ٹی وی یا یو ٹیوب ہماری زندگیوں کا اہم حصہ بن چکا ہے اب اسے اپنی زندگی سے ختم کرنا تو دور کی بات ہے اسے کچھ گھنٹوں کے لئے بند کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن خبریں، اور علم مہیا کرنے میں ٹی وی کا کردار اخباروں اور کتابوں سے کم ہے کیونکہ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جسے پلٹ کر دوبارہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس میں ایک بار آنکھوں کے سامنے سے جو گذر گیا وہ کچھ دیر کے لئے دماغ میں ٹکتا ہے لیکن جیسے ہی کوئی دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے آیا ویسے ہی پر انا نقش دھندلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹی وی پر آنے والی بڑی سے بڑی خبر بھی وہ اثر نہیں چھوڑتی جو اخبار چھوڑتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ٹی وی پر آگے بڑھنے کی دوڑ زیادہ ہوتی ہے۔ ٹی وی پر سب سے پہلے خبر پہنچانے کی دوڑ میں ٹی وی کیمرہ صرف خبروں کی اوپری سطح تک ہی رہتا ہے ٹی وی رپورٹر خبروں کی اوپری سطح ہی بتاتے اور دکھاتے رہتے ہیں نہ تو وہ ہمیں خبروں کی گہرائی میں لے جاتے ہیں اور نہ ہی اسکی وجوہات اور اثرات کے بارے میں بتاتے ہیں"۔

ہفتہ وار سوال۔ 'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

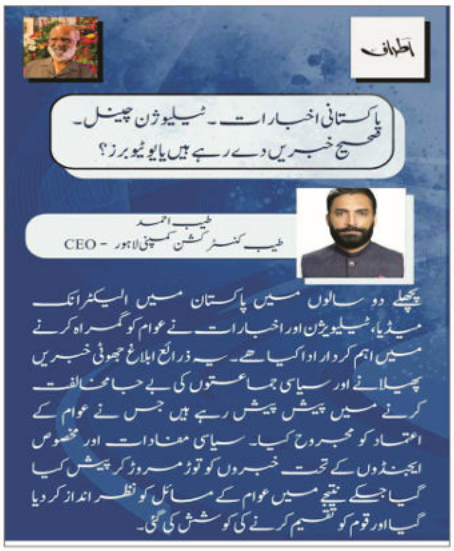

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

عالیہ زاہد بھٹی

کھڑک، کھڑک، عیاں، نہاں، حاضر موجود کے تناظر میں سب سے اہم کردار ہے لفظ خبریں کا جس کی خبر لی جائے تو صحیح اور بے خبری میں ہی گزر جایا جائے تو عادی نہیں بلکہ سب کچھ غلط ملط ہو جائے اور ہم اطراف کے گرد و نواح میں کھوئے رہ جائیں۔ اس سوال کی جس طرح کھچڑی بنا کر پوچھا گیا ہے، ہم اس کا دہی بنا کر ہی پیش کر سکتے تھے جو کیا اس دہی کی لسی جو الفاظ کی مدھانی مار مار کر نکالی ہے اس میں تیرتے ہوئے پیڑے اپنی ہیئت اور ترکیب سے بتاتے ہیں کہ "پاکستانی اخبارات جس دہی کی لسی بنانے میں ناکام ہو جائیں اس کارنامے کو ٹیلیوژن چینلز انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور یوٹیوبرز اس انجام کا انجام بخیر کرتے ہیں پھر صبح تو صبح رہی شام بھی بخیر ہو جاتی ہے اور چہار اطراف سے صبح بخیر شام بخیر انجام بخیر پڑھ پڑھ کر ہمارے مسلم دوست کہہ اٹھتے ہیں آپ سب کا تہہ دل سے خیر خیر مقدم بخیر راعنلے۔

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

عالیہ زاہد بھٹی

آپ نے کیا سمجھا تھا ہم اپنے 200 الفاظ ایک ایسے اسرار کو کھوجنے میں ضائع کر کے سب سنیں گے کہ یہ رقص شرر تھا، شرر شریر کا رقص دیکھنے کے لیے ہی تو ہم راتوں کو جاگ کر دن کا انتظار کرتے ہیں اور دن بھر یوٹیوبرز کے تہلکہ خیز انکشافات کی تصدیق کے اخبارات دیکھتے ہیں پھر ان اخبارات میں حقانیت تلاش کرنے کے لیے رات بھر نیوز اینکرز کا پتلی تماشا دیکھ کر ایک نئی صبح کا انتظار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

نسبتاً یوٹیوبر۔ پہلے تو ایک ہی PTV تھا اب الحمدللہ سارے چینلز ہی PTV ہیں۔ سچ کی تلاش میں جا بجا پھرنا پڑتا ہے۔ یااللہ خیر!

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

زبیر احمد مدنی

یوٹیوبرز ہوں یا اخبارات اور ٹیلی وژن چینل سب ہی کمانے میں لگے پڑے ہیں۔ کمانے کی خاطر سنسنی خیزی، جھوٹ اور افواہوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ معتبر صحافی کہیں جا چھپے ہیں کیونکہ وہ اس طوفان بدتمیزی کا نہ مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے ضمیر انہیں اس کی اجازت دیتے ہیں۔

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

ساجدہ سلطانہ

اس وقت نہ اخبارات سچ لکھ رہے ہیں نہ ہی ٹی وی چینل، یوٹیوب پر افواہوں کا طوفان برپا ہے، یہ دور ابہام و شک و شبہ کا دور ہے اس میں جو چیز آج صحیح لگتی ہے کل پتہ چلتا ہے کہ وہ تو سرے سے غلط ہی تھی لہٰذا، درست ملکی صورتحال جاننے کے لیے میرا خیال ہے کہ پرانے اور قابل بھروسہ صحافیوں کے تبصروں کو سننا چاہیے۔

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

اخگر انوار

آئیڈیل صورتحال تو کہیں نہیں۔ یوٹیوبرز کی اکثریت کسی نہ کسی سیاسی نکتہ نظر کی حامل ہے اس لیے سچ پیش کرنے سے زیادہ انکا ہدف سیاسی پارٹیوں کے موقف کی ترویج ہوتا ہے۔ جبکہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا ان قوتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے جو ملک کو قانون اور دستور کے راستے کی بجائے ڈنڈے سے چلا رہی ہیں۔

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

منور کلیمی

ایسے تمام پاکستانی چینلز، اخبارات، اور یوٹیوبرز جو ہمیشہ لفافہ صحافت کا حق ادا کر رہے ہیں اُن کیلئے پروین شاکر کا یہ شعر ترمیم کے ساتھ:

میں سچ کہوں گی یا کہوں گا، پھر بھی ہار جاؤں گی یا گا
وہ جھوٹ بولے گا یا گی اور لاجواب کر دے گا یا گی

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

طاہرہ ضیاء

یوٹیوب ہو یا نیشنل ٹی وی دونوں طرف آٹے میں نمک برابر صحیح مگر درست خبر دینے والے لوگ موجود ہیں۔ مگر جھوٹ زیادہ بک رہا ہے کیونکہ ہمارے لوگ اپنی پسند کا سننا چاہتے ہیں۔

پاکستانی اخبارات۔ ٹیلیوژن چینل۔ صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

فاروق احمد

یوٹیوبرز میں سے صرف ایک فیصد کسی حد تک صحیح خبریں دے رہے ہیں۔ جو سچے ہیں ان کے پاس خبر نہیں ہے اور جن کے پاس خبریں ہیں انہیں خبریں "پہنچائی" جاتی ہیں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

صوفی راؤ جاوید اختر

آجکل اخبارات ہوں نیوز چینلز ہوں یا یوٹیوبرز سب عوام کی خبر لے رہے ہیں خبر اور پروپیگنڈا میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ خبر کے نام پر پروپیگنڈا اور جانبداری کا چورن بیچا جا رہا ہے۔ تحقیق اور چھان پھٹک ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اکثر چینلز پر چھاپ لگ چکی ہے یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے۔ چینلز سارا سال مسلکی منافرت کو ہوا دیتے ہیں رمضان کے مقدس ایام میں بھی باز نہیں آتے بعد میں اس نفرت انگیز مواد کو نیٹ کے حوالے کر کے دوام بخش دیا جاتا ہے کہ دیکھتا جا شرماتا جا ان کا مقصد صرف ریٹنگ بڑھانا ہے۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

صوفی راؤ جاوید اختر

یوٹیوبرز زیادہ سے زیادہ لائک شیئر اور پیسے کے چکر میں ہوتے ہیں کہا جا رہا ہے کہ تحریک کو یوٹیوب ہی چلا رہی ہے بقول شخصے اب تو تحریک بھی یوٹیوبرز سے تنگ ہے۔ ایڈیٹنگ کا فن عروج پر ہے الفاظ کسی کے چہرہ کسی کا ٹرمپ کا کلپ ایڈٹ کر کے خان کے حق میں وائرل کر دیا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا کا بھی یہی حال ہے البتہ خبر کی حرمت کسی حد تک برقرار ہے۔ ابھی حال ہی میں USA میں 150 سے زیادہ آرٹیکل باقاعدہ ادائیگی کر کے بانی PTI کے حق میں چھپوائے گئے ہیں۔ پاکستان میں حکمرانوں کو چاہئے کہ آج کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصول و ضوابط کو نئے سرے سے مرتب کرے۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

اختر شہاب

ٹی وی وغیرہ تو پھر بھی تھوڑا بہت سچ بتا دیتے ہیں۔ یوٹیوبر تو ایک خبیث ہیں ٹائٹل کچھ ہوتا ہے اندر کچھ ہوتا ہے اور ایسے طریقے سے گمراہ کرتے ہیں کہ آدمی جذباتی ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال پی ٹی آئی کے فالوورز ہیں جو ان یوٹیوبر سے ہی گمراہ ہو رہے ہیں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

بشیر خان

ملاوٹ ہمارے ملک میں ہر چیز میں عام ہو گئی ہے۔ اس گناہ کو برا نہیں سمجھا جاتا بس یہی حال پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا ہے۔ میل ملاوٹ جاری و ساری ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر افلاطون بنا ہوا ہے اکا دکا غیر جانبدار ہوں تو ہوں باقی سب ایک تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

عبدالرؤف ابراہیم

مانا کہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے، مگر وقت صحافت اس مالی مشکلات دور میں اسطرح مالی دوراہے پہ آگئی ہے کہ خبر دینے سے پہلے صحافت سے جڑے مالی مشکلات سے نبرد آزما صحافی کو پہلے سوچنا پڑتا ہے، کہ کون سی خبر عوام تک پہنچانی ہے؟ اور کون سی خبر عوام پہنچ سے روکنی ہے؟ اور کہاں خبر سے جڑے افراد سے مالی فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں؟ اب ایسے مفاداتی حالات میں پاکستانی اخبارات، ٹیلی ویژن، یا یوٹیوبر میں کون؟ کیسے؟ صحیح خبریں پہنچا کر دے سکتا ہے؟

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

طہارت علی خان

تینوں جھوٹ ہی بول رہے ہیں۔

قمر الحسن جعفری

یوٹیوبرز

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

حافظ نعمان ساجد

آج کے تیز رفتار دور میں خبر کو عوام الناس تک پہنچنے کے لئے اخبارات سے تیز تر ذرائع ابلاغ میسر آگئے ہیں اب بات برقی میڈیا سے بھی آگے ڈیجیٹل میڈیا تک آگئی ہے تو کیا خبر اپنی درستگی اور صحت کے معیار پر بھی پوری اتر رہی ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک اخبارات آج بھی خبر کی درستگی صحت اور خبر کے مستند ہونے میں یعنی خبر کی کریڈیبلٹی کے حوالے سے روز اول کی طرح صحیح خبریں دینے میں کل کی طرح آج بھی موثر ترین و درست ترین ذریعہ ابلاغ ہے میں خود عملی صحافت سے منسلک رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ خبر اپنی صحت اور تصحیح کے حوالے سے کن کن مراحل سے گذرتی ہے بیگم صاحب کا کھانا لگانے کے لئے بلاوا آگیا اس لئے بات کو یہیں کوزے میں بند کر کے دسترخوان جانے جا رہا ہوں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

غلام اکبر

بہت خوب سوال کیا ہے اس سے ہماری اصلیت سامنے آجائے گی۔

عارف شاہ

کوئی نہیں سب مال کمانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

پاکستانی اخبارات ۔ ٹیلیوژن چینل۔
صحیح خبریں دے رہے ہیں یا یوٹیوبرز؟

ریحانہ اعجاز

پاکستان میں ٹی وی چینلز و اخبارات نے ہمیشہ اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی عمدگی سے کی ہے لیکن گزشتہ چند سال بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ قریباً ایک دہائی سے یہ ذمے داری یوٹیوبرز نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔ اخبارات و چینلز سے زیادہ متحرک انداز میں یوٹیوبرز اپنا کام کر رہے ہیں۔
یوٹیوبرز کی بدولت معمولی سے معمولی خبر بھی راتوں رات جنگل کی آگ کی مانند پھیل جاتی ہے۔

ہفتہ وار سوال۔ 'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

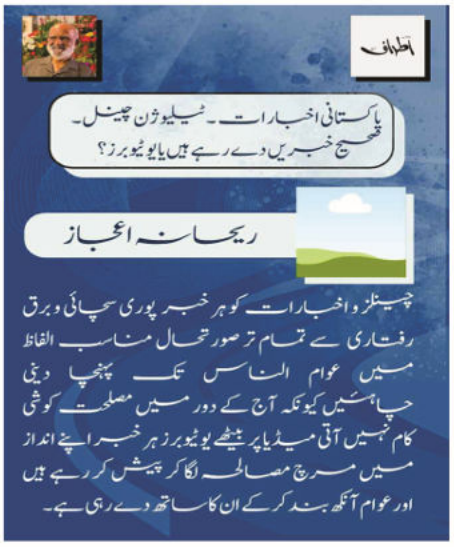

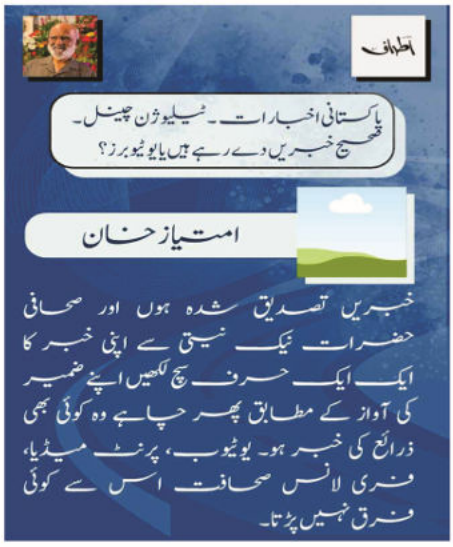

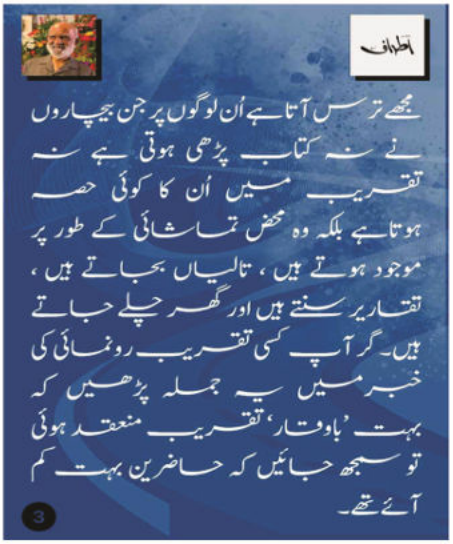

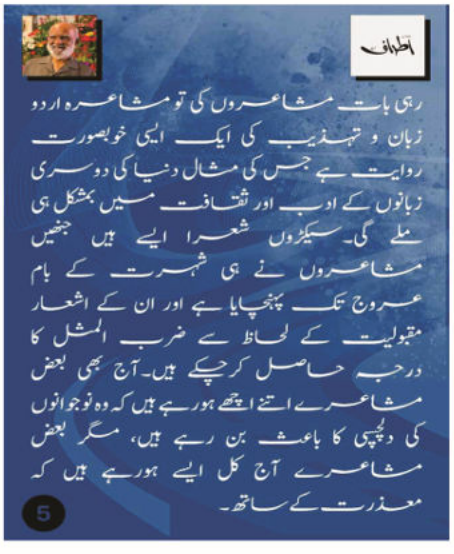

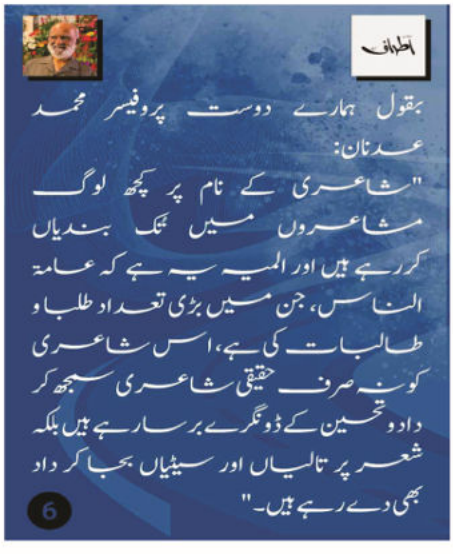

ہفتہ وار سوال۔ 'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

اطراف

اب تو سوشل میڈیا کی کرامت نے بے وزن اور بے بحر شاعروں کی بھی فین فالوئنگ بنادی ہے اور بہت سے لوگ اس میں خوش بھی ہیں۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں۔ مگر پھر بھی میں ایک بات کہوں گا کہ آج کا نوجوان مشاعروں میں دل چسپی لے رہا ہے اگر ان مشاعروں پر تھوڑی توجہ دی جائے تو بہتری کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ بہترین مشاعرے نہ صرف زبان و ادب کے دائرے کو وسیع کر رہے ہیں، بلکہ ادب اور عوام کے درمیان پُل کا کام بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

7

اطراف

اب بات ہو جائے آج کل کی ادبی تنظیموں کی۔ کچھ ادبی تنظیمیں بہت اچھا کام کر رہی ہیں جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ میں ان تنظیموں کے لئے بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق ادب بھی تخلیق کریں ۔ اس کی عوام تک رسائی کا اہتمام بھی کریں وہ تنظیمیں جو اپنا ایک وسیع دائرہ کار رکھتی ہیں، وہ اس حوالے سے اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ادب کی عوام تک رسائی میں ہمارا الیکٹرانک میڈیا / سوشل میڈیا بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

8

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

طیب احمد
طیب کنسٹرکشن کمپنی لاہور - CEO

ادبی تنظیمیں مشاعرے اور کتابوں کی رونمائی کی تقریبات اردو ادب کی خدمت کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ یہ پلیٹ فارم نوجوان لکھاریوں اور شاعروں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جو ادب کے فروغ میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ کئی تقریبات محض ذاتی تشہیر اور مخصوص حلقوں کی تعریف تک محدود ہو گئی ہیں۔

1

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

صوفی راؤ جاوید اختر

ادبی تنظیمیں ادب کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں ادب کے مستقبل کو مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں اگر ادبی تنظیمیں نہ ہوں تو ادب کی نمائندگی کون کرے گا۔ برصغیر پاک و ہند میں مشاعرے کی تاریخ بہت قدیم ہے مشاعروں نے شاعری کو مقبول عام بنانے اور شاعری کو اپنا وجود برقرار رکھنے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے مشاعرے اس دور میں بھی ہوتے تھے جب پرنٹ میڈیا اور ریڈیو تک کا وجود نہیں تھا اگر مشاعرے نہ ہوتے تو آج جو اشعار غزلیں نظمیں زبان زد عام ہیں وہ صرف خواص اور علمی حلقوں تک محدود ہوتیں۔

1

اطراف

معیار کی بجائے تعلقات اور تعارف کو اہمیت دینے کی وجہ سے نوجوانوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رویہ ادب سے وابستگی کم کرنے اور نوجوان نسل کو بیزار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ج ایسے محافل کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کو ہم کلام ہونے کا موقع فراہم کریں اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انٹریکشن کیا جائے۔ اس سے نہ صرف نوجوانوں کا انٹرسٹ بڑھے گا بلکہ وہ ادب کے اصل مقاصد اور روایات سے جڑ سکیں گے۔

2

اطراف

ادب کے معیار کو بلند کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تقریبات کو دیانتداری معیار اور شفافیت کے اصولوں پر استوار کیا جائے اور نوجوانوں کی شرکت اور دلچسپی کو ترجیح دی جائے تاکہ اردو ادب کا وقار بلند ہو اور نئی نسل اس کا حصہ بننے پر فخر محسوس کرے۔

3

اطراف

موجودہ دور میں بھی مشاعرہ عوام میں ادبی اور شعری ذوق کی آبیاری میں بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ کتابوں کی رونمائی عوام میں کتابوں کا تعارف کرواتی ہیں جس سے لوگوں میں کتاب سے تعلق پیدا ہوتا ہے مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا ہے کتاب لکھنے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ علمی اور ادبی سرگرمی کو فروغ ملتا ہے جس سے ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

2

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

مختار بٹ

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ادبی تنظیمیں مشاعرے اور کتابوں کی رونمائی کی تقریبات منعقد کر کے ان روایات کو زندہ رکھ رہی ہیں لیکن کم دلچسپی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسٹیج پر وہی پرانے چہرے تقریباً ہر تقریب میں نظر آتے ہیں جو عدم توجہی کا باعث بنتے ہیں۔

1

اطراف

ضرورت اس بات کی ہے جوان قیادت کو بھی موقع فراہم کریں اس کے علاوہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ماہ کوئی نہ کوئی تقریب ہونی چاہیے اور آخر میں ۱۵ سے ۲۰ منٹ کا سوالات کا سیشن ہونا چاہیے۔ اس طرح کی involvement سے لوگوں میں شوق پیدا ہوگا۔ شام صاحب آپ کی کاوشوں سے انشاءاللہ نئی نسل مستفید ہوتی رہے گی۔

2

ہفتہ وار سوال۔ 'اطراف' پرنٹ اور ڈجیٹل دونوں کے لیے

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

خواجہ

ہمارے ملک میں کافی عرصے سے متمول طبقہ اپنے بچوں کو کیمرج سسٹم کے طریقہ تعلیم کو ترجیحی بنیادوں پر اپنا رہا ہے۔ چنانچہ بچے او لیول اور اے لیول کی تیاری کرتے ہیں۔ اس مین بلا شبہ میٹرک اور انٹر میڈیٹ کے مقابلے میں طالب علم کہیں زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں۔

1

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

مگر اس نصاب میں اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ اور یہ طالب علم اردو ذبان کے لٹریچر سے انتہائی نا بلد رہتے ہیں۔ اس صورت حال میں ایسی کاوشیں اردو ادب کی ترویج کے لیے بہت مفید ھیں اور ایسے نوجوانوں کو اردو ادب سے متعارف کروا رہیں ہیں۔ ورنہ ھندی سینیما اور ٹی وی کے ڈراموں کے علاوہ اردو سیکھنے کا کوئی فورم نھیں ایسے میں اس طرح کی تقریبات اردو ادب کی شاندار خدمت کر رھی ھیں۔

2

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

شاہد محی الدین

آج کل یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ نشری نشست جس میں پر مغز اور معلومات افزا تقاریر ہوتی ہیں۔ سیر حاصل گفتگو کے بعد شعری نشست اور مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ ادبی پروگرام کے اس طرز نو کا کیا سدباب ہے؟

1

اطراف

کل اتوار کو شہر کی آرٹس کونسل، سرسید یونیورسٹی، شادمان ٹاون، نارتھ کراچی بیٹھک، ڈسٹرکٹ سینٹرل آرٹس کونسل کی تقاریب مشاعرے کی دعوت ملی کسی میں بھی شریک نہ ہو سکے کہ اطراف کی تقریب میں گلشن معمار سے سہ پہر نکل کر پہنچے مغرب تک ڈیڑھ گھنٹے انتظار آغاز تقاریر ڈنر اور پھر اسٹاپ پر ایک گھنٹہ اگلا ایک گھنٹہ گھر تک اذیت ہوئی۔ تقریب بلا شبہ اچھی ہوئی مگر مہمان خصوصی و صاحب اعزاز نے تاخیر کروائی۔ سلامت رہیں!

3

اطراف

کراچی کی سڑکیں غربت کی انتہا پر پہنچے عوام کی لاتعداد گاڑیاں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی رکاوٹیں عبور کر کے پہنچنا پھر واپسی نہایت دشوار تکلیف دہ امور و اسباب ہیں۔ ہمارے زمانے 2010ء تک باہمی طور پر تنظیمیں تقریبات کا انعقاد کرتیں تو دن تاریخ سے پانچ دن پہلے اطلاع دی جاتی تھی۔

2

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

سید انور جاوید ہاشمی

مشاعرے اور رونمائی و پذیرائی کی تقاریب میں منتظمین یا میزبان شرکائے محفل مدعو کیے جانے والوں کے وقت متعینہ پر پہنچنے کی توقع رکھتے ہیں۔ مشاعرے کے لیے نوجوان یا جونیئر جان بوجھ کر تاخیر سے شریک ہوتے ہیں کہ ان کو پہلے دوسرے نمبر پر نہ پڑھوایا جائے۔ چار بجے کا وقت دیا جاتا ہے صاحب اعزاز اپنے نوحہ گروں کو گھر سے لے جانے پہنچانے کے مکلف ہوں تو دو گھنٹے کی تاخیر لازمی ہے۔

1

اطراف

ادبی تنظیمیں۔ مشاعرے۔ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات۔ اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں ادب کا معیار بڑھا رہی ہیں یا نوجوانوں کو ادب سے بیزار کر رہی ہیں؟

محمد عارف سومرو

مشاعرے اور ادبی تقریبات اردو ادب کے کلاسیکی اور جدید ورثے کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے نئی نسل کو ماضی کے ادبی شہ پاروں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ مشاعروں میں سننے والوں کو زبان کی خوبصورتی اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، جو زبان کے فروغ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مشاعرے اور ادبی تقریبات مختلف خطوں، طبقوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو یکجا کرتی ہیں، جس سے معاشرتی اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ ملتا ہے۔

1

اطراف

یہ تقریبات ادبی تبادلہ خیال کا موقع فراہم کرتی ہیں، جہاں پر شعراء اور ادیب اپنی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہیں، اور سامعین کو ادب سے جڑنے کا موقع ملتا ہے۔ اس طرح کی محافل اردو زبان کی ترویج میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ تخلیقی اور فکری عمل ادب کو نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔

2

اطراف

ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، اور مشاعروں کے ذریعے سماجی مسائل، انصاف، آزادی، محبت، اور امن جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسی طرح تقریبات سامعین کو سوچنے اور ان مسائل پر غور کرنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی تنظیمیں مشاعروں اور ادبی تقریبات کے انعقاد کے ذریعے اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔

3

BIN AHSAN
Builders & Developers

BIN AHSAN GREEN CITY PHASE-I

PROJECT OF BIN AHSAN BUILDERS AND DEVELOPERS

اعتماد کی دنیا میں بڑا نام بن احسان

بن احسان گرین سٹی میں ترقیاتی کاموں کا آغاز ہو چکا ہے، 120 گز کے پلاٹ پر خصوصی رعایت
کے لیے رابطہ کریں اور آج ہی اپنا پلاٹ بک کرائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ بنائیں۔

A PIECE OF LAND
THAT EVERYONE CAN AFFORD !

MEMBER OF: abad

Universal Account Number : 03-111-155-530

www.binahsanbuildersanddevelopers.com

HEAD OFFICE LOCATION : OFFICE # 59,60 1ST FLOOR JABL-E-REHMAT TOWER ,GULISTAN-E-JAUHAR BLOCK 16A

Bridging Extremes

Monthly "ATRAAF" Karachi

February 2025

Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com